دبستانِ مومن

ظہیر احمد صدیقی

دبستانِ مومن

"دستورِ اصلاح" اور دوسری جوشؔ ملیسانی کی "آئینہ اصلاح"۔ سیمابؔ اکبرآبادی نے اپنی کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت خاصا طویل مقدمہ لکھا ہے۔ مثلاً

۱: اپنی اصلاح :۔ یعنی شاعر کے لیے پہلے اپنی اصلاح ضروری ہے۔ ۲: اصلاحِ خیال ۳: مجلسی اور اجتماعی اصلاح ۴: مشاعروں کا زبردست تنظیمی عمل ۵: ضروری اصلاح ۶: اصلاح لینے کا طریقہ ۷: اصلاح دینے کا طریقہ ۸: شعرائے متعلقین کا طریقۂ اصلاح۔

ان موضوعات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے استادی اور شاگردی کے رشتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

فنِ اصلاح کو سمجھنے کے لیے سیمابؔ کی کتاب کا مقدمہ بہت اہم ہے۔ سیمابؔ نے مختلف تذکروں اور دیگر ماخذوں سے اردو کے بڑے شاعروں کے طریقۂ اصلاح کی مثالیں فراہم کی ہیں اور یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ پہلے شعر، پھر اصلاح اور پھر اصلاح کی توجیہہ۔ اس سے کی سمجھ میں فن کے بہت سے رموز آتے ہیں۔

دوسری کتاب "آئینہ اصلاح" ہے۔ جوشؔ ملیسانی نے اپنے شاگردوں کے اشعار پر جو اصلاحیں دی ہیں انھیں مرتب کر کے اس کتاب میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو سیماب کا تھا، یعنی پہلے شعر، پھر اصلاح اور پھر توجیہہ۔

اِس کتاب کے مقدمے میں جوشؔ ملیسانی نے لکھا ہے جو بہت عالمانہ اور بصیرت افروز ہے۔ ہماری نئی نسل کے شاعروں کو سیمابؔ اکبرآبادی اور جوشؔ ملیسانی دونوں کی کتابوں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

مومن خاں مومنؔ اپنے عہد کے صفِ اوّل کے شاعر تھے۔ بلکہ ان کے عہد کے شاعروں کی فہرست اِس طرح بنتی تھی:

ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ ۔۔۔ بعد کے زمانے میں فہرست کی ترتیب بدل گئی اور اب پہلا نام غالبؔ کا پھر مومنؔ اور ذوقؔ کا آتا ہے۔

مومنؔ کو اپنے عہد میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی اور اس مقبولیت کو دیکھتے ہوئے حیرت ہے کہ ان کے صرف اٹھاسی شاگردوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی غالباً وجہ وہی ہے، جو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

ان کے جو اشعار ملتے ہیں ان سے فکر بلند اور مضامین دل پسند کا پتہ چلتا ہے خیال کو روزمرہ میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اہلِ کمال بے ساختہ داد دیتے تھے۔ ان کے کلام میں اس دور کی سیاسی کش مکش کا بھی سراغ ملتا ہے۔ ہمارے دعوے کی تائید اشعار ذیل سے ہوتی ہے۔

ہُوا برباد کیا اے ہم سفیرو آشیاں اپنا
کہ گلشن میں رہا باقی نہ کچھ نام و نشاں اپنا

نہیں کچھ بود و نابود جہاں ہائے غم و شادی
کہ یاں اسباب دنیا کو نہ ہرگز دیر پا دیکھا
گدا کو اے ظہور اک دم میں دیکھا یاں غنی ہوتے
غنی کو ایک لمحہ میں یہاں ہوتے گدا دیکھا

حیراں ہوں دیکھ کر سرِ مژگاں پہ اشک کو
کیوں طفلِ بے گناہ کو کھینچا ہے دار پر

گردش ہے مجھے چشم کی مانند ہمیشہ
آوارہ میں گھر میں ہوں مسافر ہوں وطن میں

دلوں میں جب سے ہے فراق دلبر ادھر ہمارے اُدھر تمھارے
جہاں میں چرچے یہی ہیں گھر گھر ادھر ہمارے اُدھر تمھارے

ہے چار طرف حُسن کی جس کے یہ تجلّی
وہ شاہدِ یکتا نہیں معلوم کدھر ہے
اے اشک مرے دیدۂ نمناک سے باہر
جاتا ہے کدھر تو تو مرا لختِ جگر ہے (۱)

---

(۱) تحفہ خانہ جاوید ص ۴۷۹۔ سخن شعرا ص ۳۱۱۔ بزم سخن ص ۸۳

عظمت ـــ عظمت اللہ

میر عظمت اللہ پیرزادوں کے خاندان سے تھے۔ ان کے والد میر عزت جذب تھے عظمت اللہ بریلی میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں باپ کے ہمراہ بلخ، بخارا اور کشمیر کی سیر کے لیے نکل گئے۔ شیفتہ گلشن بے خار میں لکھتے ہیں :-

"میر عظمت اللہ خاں خلف الصدق میر عزت اللہ خاں مرحوم المتخلص بہ جذب در بریلی از نہاں خانہ بطون بہ جلوہ گاہ ظہور سر کشیدہ در آوان صبا بہ معیت والد بزرگوار خود اکثر بلاد را مانند بلخ و بخارا و کشمیر وغیرہ ان دریافتہ۔ اکنوں در جہاں آباد بوقع وقار تمام می گزارند۔" (۱)

آخر میں دہلی میں مستقل قیام کیا اور یہاں مومن خاں سے تلمذ کیا۔ شعر بہت کم کہتے تھے مگر تعجب یہ ہے کہ تمام تذکروں میں ان کا صرف ایک شعر ملتا ہے۔ شیفتہ اپنے تذکرے میں تحریر کرتے ہیں :-

"نہایت مرتبہ صاحب فطرت ارجمند است۔ طبع خوش دارند۔ فکر شعر کم تری کنند گاہ گاہ در بزم مشاعرہ شریک می شود باداعی اتم راہ و رسم شناسائی مربوط است۔" (۲)

ان کا جو شعر تذکروں میں ملتا ہے وہ یہ ہے :-

نام عظمت ہے نہ شوکت نہ شکوہ کیا ہی اس نام سے گھبراتا ہوں (۳)

عنایت ـــ عنایت علی خاں۔ ولادت ۱۸۱۳ء/۱۲۲۹ھ وفات ۱۸۴۷ء/۱۲۶۳ھ

عنایت علی خاں کا شمار بھی خاندان نوابان رام پور سے ہوتا ہے۔ یہ صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے چھوٹے بھائی تھے۔ (ان کا شجرہ بیتاب کے ذکر کے سلسلے میں بیان کیا جا چکا ہے) یہ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام امام بخش صہبائی کو اور اردو کلام میر حسین تسکین کو دکھایا کرتے تھے۔ چنانچہ طبقات الشعرا میں کریم الدین لکھتے ہیں :-

نظم ریختہ اور فارسی دونوں کا شوق اس کو ہے۔ فارسی کی اصلاح امام بخش صہبائی سے لیتا ہے اور ریختہ کی اصلاح میر حسین تسکین سے۔ (۴)

مگر امیر مینائی کا بیان ہے کہ مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔

(۱-۲) گلشن بے خار ص ۱۳۶ (۳) جلوہ خضر ص ۲۴۵۔ طبقات الشعرائے ہند ۳۷۶۔ گلشن بے خار ص ۱۳۶۔ (۴) خوش معرکہ زیبا (قلمی) ص ۱۲۲۔ سخن شعرا ص ۲۲۳۔ بزم سخن ص ۸۷ (۴) طبقات الشعرائے ہند ص ۲۷۶

مومن خاں دہلوی سے اس فن میں مشورہ تھا۔ یہ مقتضائے نزاکت خیال انھیں کا دم بھرتے تھے۔(۱)

امیر مینائی لکھتے ہیں کہ ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷ء میں بہ عمر ۳۵ سال رحلت کی۔ اسی اعتبار سے ان کی پیدائش ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء کی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے ایک باورچی کو ان سے عداوت تھی۔ ایک دن موقع پاکر اس نے زہر کھلا دیا۔ درگاہ حضرت باقی باللہ میں جگہ پائی۔

عنایت کے اوصاف یادگار انتخاب میں امیر مینائی کی زبانی سُنیے :۔

" مرد کامل الوجود اور جوان خوش رو تھے۔ زور و طاقت کی بدولت پہلوانوں کے قوتِ بازو تھے۔ خوش نویسِ بے بدل خطِ شکستہ میں ضرب المثل .... الغرض ایسے اہلِ کمال نہ دیدہ نہ شنیدہ۔ جناب مستطاب نواب محمد سعید خاں صاحب بہادر جنت آرام گاہ کے عہد میں اپنے والدِ ماجد کی جگہ کارنہایت نظم و نسق ریاست میں مصروف رہتے تھے۔(۲)

ان کی شاعری کے متعلق انتخابِ یادگار میں امیر مینائی لکھتے ہیں :۔

" آفرینش مضامین تازہ کی قوت ہر شعر سے پیدا ہے۔ بذلہ سنجی اور نازک خیالی کی کیفیت ہر مضمون سے ہویدا ہے۔(۳)

کلام کبھی یک جا نہیں کیا جس کی وجہ سے اکثر ضائع ہو گیا۔ ان کا ایک قلمی نسخہ بارہ صفحات کا کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔

مجھ سے آنکھیں مری لے لو کہ یہ کام آئیں گی
میں نہ ہوں گا تو بہت آپ کو رونا ہوگا
غیر کو مجھ سے ملاتے ہو مری خاطر سے
آپ اپنے لیے رہنے دیں یہ احساں اپنا

---

(۱) انتخاب یادگار ص ۲۳۴۔
(۲) " " " " ۲۳۳
(۳) " " " " ۲۳۴

یار سے کس کی عنایت نہیں بگڑی ہوگی
تو نے کیا حال بنایا ہے یہ ناداں اپنا

موت سے روز وعدے کرتا ہوں
صاف کہہ دو اگر نہیں آتے

کس شوق سے جاتا تھا عنایت سوئے مقتل
زنداں سے نکلنے کا تجھے غم نہ ہوا حیف

عنایت شام سے اتنا تڑپنا
ترا احوال کیا ہوگا سحر تک

ہوتی نہیں مقبول کریں لاکھ دعا ہم
اللہ طلب کرتے ہیں کیا جانیے کیا ہم

اے شبِ ہجر ترے ہاتھوں
آج بچتے نظر نہیں آتے
لب تلک اب تو ناتوانی سے
نالے بے اثر نہیں آتے

کیوں ترک کریں بندگیِ میکدہ واعظ
کعبہ میں نہ ہو جائیں گے بندے سے خدا ہم

لذّت نہ پوچھ مجھ سے دمِ ذبح کہ کہوں
احسنت سے زباں کو فرصت اگر ملے

غمگین ـــــ میر عبداللہ ـــ متوفی ۱۸۴۹ء/۱۲۶۶ھ

یہ میر حسین تسکین کے بیٹے اور آہی کے بھائی تھے۔ رام پور میں بسلسلہ ملازمت مقیم رہے۔ عین عنفوانِ شباب میں جبکہ ۲۳ برس کی عمر تھی۔ ۱۸۴۹ء/۱۲۶۶ھ میں انتقال کیا۔[1] مقبرہ نواب احمد علی خاں میں دفن ہوئے۔

نمونہ کلام یہ ہے:-

کی مری مٹی عزیزوں نے خراب
ہائے لاکر خانہ خمار سے

شورِ بختی نے مزا اور چکھایا دل کو
نالہ سوزِ زخمِ جگر پر نمک افشاں نکلا

وہ خبر ہی جاں گزا تھی جس کو سُن کر مر گیا
ورنہ اِک تیشہ سے ہوتا کام کیا فرہاد کا

آتے ذرا نہ اور تو مر ہی چلے تھے ہم
تم نے تو کہہ دیا کہ ہمیں کچھ خبر نہیں

کمی کریں جگر و دل تو کیا کروں یا رب
کچھ اور دے مجھے مژگانِ خوں فشاں کے لیے

---

(۱) انتخاب یادگار ص ۲۷۱

اُمّتِ نوح پہ طوفان ہی آیا یارو
شکر یہ ہے کہ مرا دیدہ خونبار نہ تھا

اب آ یوں ہی مرے سینے سے لگ جا
گرہ وا ہو چکی بندِ قبا کی

مجھے تو روزِ ہجراں کی مصیبت یاد ہے واعظ
کچھ ایسا ہو کہ تیرے دِل سے دُھڑکا حشر کا نکلے

کیا منکر و نکیر پہ بنتی ہے دیکھیے
ہمراہ میری گور میں تصویرِ یار ہے(۱)

غُربتؔ — ہدایت علی خاں۔ ولادت ۱۸۱۲ء/۱۲۲۷ھ

صاحبزادہ ہدایت علی خاں۔ خلف نواب عبدالعلی خان بیتابؔ اور عنایتؔ کے بھائی ہیں (ان کا شجرہ بیتابؔ کے ذکر میں تحریر کیا جا چکا ہے) ان کا ذکر صرف یادگارِ انتخاب میں ملا۔ امیر مینائی تحریر کرتے ہیں:۔

"یہ صاحبزادے بڑے خوش صفات ہیں۔ جامع کمالات ہیں۔ اکثر فنون کا شوق ہے۔ صنائع میں ایجاد کا ذوق ہے(۲)

یہ اوّل حکیم مومنؔ خاں کے شاگرد ہوئے۔ (لطف یہ کہ نواب عبدالعلی خاں کے خاندان کے بیشتر افراد مومنؔ ہی کے شاگرد تھے) پھر مہدی علی ذکیؔ مراد آبادی سے تلمذ ہوا(۳)

---

(۱) انتخاب یادگار ص ۲۷۱۔ طور کلیم ص ۷۵۔ سخن شعرا ۳۵۳۔ بزمِ سخن ۸۹۔ گلستانِ سخن ص ۳۸۱

(۲) انتخاب یادگار ص ۲۶۴

(۳) " " "

انتخاب یادگار کی یالیف کے وقت ان کی عمر ۶۳ برس کی تھی، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ۱۸۱۲ء/۱۲۲۷ھ کی ہے۔ کلام معمولی ہے۔ کوئی خاص ندرت اور اچھوتا پن نظر نہیں آیا۔ البتہ انداز صاف ہے:-

سینکڑوں سجدے کیے اس در پہ تب تسکین ہوئی
گھس گئی ساری جبیں جب دردِ سر کچھ کم ہوا

جلوہ دکھا کے تم بام سے اُترو صاحب
دیکھو دل اور ہمارا تہ و بالا ہوگا

شاید ترے مریض کے ہاتھ آگئی تھی نبض
عرش بریں پر آج دماغِ حکیم تھا

کیں کاوشیں تو ناخن تدبیر نے بہت
عُقدہ نہ ایک بھی مشکل کا وا ہوا

غرورِ حُسن کا نشہ کبھی جو رخصت دے
تو اپنے بے خبروں کی بھی کچھ خبر لیتا

ثابت رہا نہ عالمِ وحشت میں پیرہن
دامن سیا جو ہم نے گریباں نکل گیا

گل کے کھانے کا جو اقرار نہ سنتا مجھ سے
ہاتھ کا اپنے وہ چھلّا نہ نشانی دیتا

تَن ہُوا سُوکھ کے کانٹا تو ہوا، کیا غم ہے
خوش ہُوں اب بھی نہ ترا گوشۂ داماں چھوٹا
بسملِ غم ہُوں مگر ہے میری صحبت دل چسپ
داغ سے میرے نہ پھایا کسی عنواں چُھوٹا
کیا کہوں ہو کے گرفتار جو پایا ہے مزہ
مَر ہی جاؤں گا اگر خانۂ زنداں چھوٹا

اگر وہ نصف شب ہو جلوہ فرما ماہتابے پر
شبِ تاریک میں ہو یک بیک نورِ سحر پیدا [(۱)]

غریب —— غریب اللہ

غریب اللہ نام، غریبؔ تخلص۔ یہ شاہ آباد کے رہنے والے تھے اور مومنؔ کے تلامذہ میں تھے۔ سخن شعرا میں ان کو انگریزی پلیٹن کا منشی لکھا ہے صرف تین اشعار کا پتہ چلتا ہے :-

ان کو دل دے کے کوئی کیا خوش ہو   دِل رُبا دِلبری نہیں کرتے

خضر و عیسیٰ و جام آبِ حیات   لب سے کچھ ہم سری نہیں کرتے

مفت میں پامالِ اعدا ہو گیا تو اے غریب   ہم تو سمجھاتے تھے کوئے دِلرُبا میں تو نہ جا [(۲)]

غنیؔ —— مولوی عبد الغنی۔ متوفی ۱۹۰۴ء / ۱۳۲۲ھ

مولوی عبد الغنی ایک باوضع اور نیک سیرت بزرگ [(۳)] تھے۔ ان کے والدِ ماجد کا نام

---

(۱) انتخاب یادگار۔ ص ۲۶۴

(۲) گلستانِ سخن ص ۳۷۸۔ جلوۂ خضر ص ۲۴۵۔ سخن شعرا ص ۳۵۰

(حاشیہ (۳) آگے)

مولوی رفیع الدین تھا۔ مومنؔ کی صاحبزادی محمدی بیگم کے شوہر تھے۔ ابتدا میں غازی پور میں وکالت کی اور بعد کو مستقل طور پر سیتا پور میں مقیم ہو گئے۔ چوں کہ اپنے پیشے سے زیادہ لگاؤ نہ تھا، اِس لیے کامیاب وکیل کبھی نہ کہلائے۔ مولوی عبدالغنی کے سیتا پور پہنچنے کے سال کا تعیّن نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان کی پہلی بیوی (دختر مومن) محمدی بیگم ان کے ساتھ تھیں۔ اور ان کے کئی اولادیں ہوئیں۔ جب محمدی بیگم نے ۱۲۹۷ھ میں وفات پائی تو ان کے بعد مولوی صاحب نے غالباً دو شادیاں کیں۔ محمدی بیگم کا مزار سیتا پور میں عیدگاہ کے قبرستان میں ہے۔ ان کی قبر پر عبدالغنی کا قطعہ تاریخ نصب تھا جس کا آخری شعر یہ تھا:۔

اے غنی مصرعِ تاریخ سر قبر نویس
بہ سُوئے ملکِ عدم ہم نفس و ہم دم رفت

اور اس قبر کے نزدیک ہی عبدالغنی خود مدفون ہیں۔

عبدالغنی کی سیرت کے بارے میں نادم سیتا پوری مولوی عبدالماجد دریابادی کے ایک خط کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:۔

"مولوی عبدالغنی مرحوم کو اپنے بچپن میں بارہا دیکھا۔ والد مرحوم (مولوی عبدالقادر صاحب ڈپٹی کلکٹر سیتا پور) سے ملنے اکثر تشریف لاتے رہتے۔ خود بھی ایک ادہ بار ان کے جا کر دعوت کھانے کا اتفاق ہوا۔ اتنا ہوش اس وقت کہاں تھا کہ ان کے کلام وغیرہ کو کچھ سمجھ سکتا۔ صرف اِتنا

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(۳) مولوی عبدالغنی کے بارے میں یہ تمام تفصیلات، یادگارِ مومنؔ، شائع کردہ اردو مجلس حیدر آباد کے ایک مضمون (مومنؔ کے پس ماندگان، از نادمؔ سیتا پوری) سے دستیاب ہوئی ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس امر میں کہ وہ مومنؔ کے شاگرد تھے اور ان کا کوئی کلام بھی موجود ہے۔ عام طور سے تذکرے اور تاریخ خاموش ہیں۔ البتہ یہ ضرور تعجب ہے کہ نادمؔ صاحب نے ان کے شاگردِ مومن ہونے کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ انھوں نے بعض ایسے اصحاب سے معلوم کیا ہوگا جن کو براہِ راست مولوی صاحب موصوف سے نیاز حاصل رہا ہوگا۔

یاد ہے کہ ان کی خدا ترسی اور عبادت گزاری کی شہرت عام تھی۔ قد لانبا تھا۔ کثیر الاولاد تھے۔ چہرے پر نورانیت تھی۔ ضعیفی کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ ڈاڑھی کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ مرحوم کا تخمینی سالِ وفات ۱۹۰۲ء کہہ سکتا ہوں۔ یقیناً ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۰ء کے درمیان۔"

مولوی عبدالغنی نام تھا اور غنی تخلص کرتے تھے۔ مومن کے شاگردوں میں تھے۔ انھوں نے اپنا شعری میدان حمد و نعت تک محدود رکھا۔ ان کا ایک اردو منظوم میلاد نامہ نادم سیتاپوری صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی مجموعۂ غزلیات بھی ہو مگر کہیں دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا۔ اسّی صفحات پر مشتمل یہ میلاد نامہ ضیا الابصار فی ولادت سید الابرار ۱۸۷۷ء میں سیتاپور سے شائع ہوا تھا۔

غنیؔ کے کلام کا تو پتہ نہیں چلا۔ البتّہ ایک قصیدے کے کچھ اشعار جو انھوں نے اپنے ایک دوست کو مدح میں لکھے تھے۔ وہ نادمؔ سیتاپوری کے مضمون کے توسّط سے ہم تک پہنچے ہیں

للہ الحمد ہوا نیرِ اقبال نمود
ظلمتِ جہل ہوئی دُور طفیلِ محمود
امدن ابرِ کرم ذات ہے تیری سید
تیرے ابِ فیض سے سرسبز ہے کشتِ مقصود
تیری تدبیر نے اس وقت میں وہ کام کیا
جس کے باعث سے ہوئی قوم کی شکل بہبود
مرحبا سید والا تیری ہمدردی کو
آفریں دل کو ترے جو کہ بنا دود آلود
طفلِ مکتب ہیں ترے سامنے حکمائے سلف
تیری تدبیر کے قائل ہیں نصاریٰ و یہود
چین و آرام کو اسی واسطے چھوڑا تم نے
[illegible] اصلاح [illegible] قوم کا پورا مقصود

نے پیش کی ہے کہ مومن خاں مومنؔ مختلف فنون کے ماہر تھے اور جن میں وہ بہت مصروف رہتے تھے۔ اِس لیے انھوں نے شاگرد سازی میں کوئی خاص دل چسپی نہیں لی۔

بہرحال مومنؔ کا سب سے بڑا افتخار یہ ہے کہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ جیسے بڑے شاعر ان کے شاگرد تھے۔ مومن خاں مومنؔ، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے خاندان کا سب سے محبوب موضوع ہے۔ ان کے والدِ محترم پروفیسر ضیا احمد بدایونی کو مومنؔ سے غیر معمولی دل چسپی تھی اور انھوں نے مومن پر بہت اچھا کام کیا تھا۔ انھوں نے مومنؔ کے کلام کے دو مجموعے مرتب کر کے شائع کیے تھے۔ ایک تو غزلوں کا دیوان اور دوسرے قصائد کا مجموعہ۔

میرے محترم اُستاد پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے مومن خاں مومنؔ پر تحقیقی مقالہ لکھا جس پر دِلّی یونیورسٹی نے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ مومنؔ کا فارسی نثر کا ایک مجموعہ ہے جس میں مومنؔ کے تحریر کردہ دیباچے اور تقریریں شامل ہیں۔ ظہیر صاحب نے اس کتاب کے متن کا تنقیدی اڈیشن تیار کر کے شائع کیا ہے۔ اس سلسلے کی تیسری کتاب وہ ہے جس میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے انیسویں صدی کے نصف ابتدائی حصّے میں لکھے گئے تذکروں میں سے مومنؔ کے شاگردوں کے ترجمے نکال کر کتابی صورت میں مرتب کیا ہے اور ان شاگردوں کا کلام بھی پیش کیا ہے۔ اس طرح مومن کے تلامذہ کا ایک اچھا تذکرہ مرتب ہو گیا ہے، جسے انجمن ترقی اُردو (ہند) شائع کر رہی ہے۔

خلیق انجم

کون ہمدرد دنیاد قوم کا سیّد کے سوا
کس نے بتلایا سوا اس کے طریق بہبود
نیرِ عظمتِ اقبال جناب سید
کرو تاباں یسر اہلِ جہاں ربِّ ودود
حاسدوں کو جو حسد ہو تو بلا سے ہووے
سنتے آئے ہیں کہ اچھے ہی ہوئے ہیں محمود
قوم کے واسطے کیا کیا نہ کیا سیّد نے
جس کی توصیف وثنا ہو نہیں سکتی محدود
کیوں نہ ہو' کالج کوئل' کو شرف اب جو بنا
جانشیں ' سیّد والا ' کا محمد محمود
غم نہیں قوم کو کچھ بھی نہ عدو کا کھٹکا
للہ الحمد کہ ہے قوم میں سید موجود
اپنے محسن کو نہ مانو گے تو ہو گے برباد
سن لو اب غور سے مشہور قصص " عاد و ثمود "
طعن و تشنیع نہیں زیبا اسے جانے دو
رنجش و بغض و حسد اس سے محض ہے بے سود
گوش دل سے مری اس بات کو سن کر مانو
دل غنی ہے تو اسے کچھ نہیں پروائے صود

قلق — مولا بخش ۱۸۳۳ء/۱۲۴۹ھ وفات: ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ

حکیم مولا بخش قلق کا اصلی وطن میرٹھ تھا(۱) مگر تحصیل علم کا شوق تھا کہ کسب کمال کے لیے وطن ترک کیا اور دہلی میں آ کر بس گئے۔ یہاں مختلف علماء سے اکتسابِ علم کیا۔

(۱) جلال انجم نے اپنے تحقیقی مقالے میں قلق کی پیدائش ۱۸۳۸ء/۱۲۴۹ھ تحریر کی ہے۔ ان کا خیال ہے :۔ محمد مشتاق شارق سے تاریخ پیدائش اندازاً ۱۸۳۰ء تحریر کی ہے۔ کلب علی خاں

فارسی کا درس مولوی امام بخش سے لیا، صرف نحو اور منطق وغیرہ مولوی انتظام علی سہارنپوری سے پڑھی اور طب میں حکیم نقشبند خاں کے شاگرد ہوئے۔

تو دیکھ قلقؔ میرے مراتب حکما میں
کچھ شعر مرا فخر نہ کچھ ناز غزل پر

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں جہاں بہت سے لوگ آوارہ وطن ہوئے۔ ناچار قلقؔ کو بھی جنھوں نے دہلی کو وطن بنانے کا تہیہ کر لیا تھا پھر میرٹھ واپس جانے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا اور بقیہ عمر وہیں گزار دی۔ آخر ۱۷ر جولائی ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔ گلاب سنگھ مشتاق نے تاریخ کہی۔

ہائے استادِ من کجا رفتہ

قلقؔ کا کلیات ان کے چھوٹے بھائی نے مرتّب کیا اور اس پر مقدّمہ مولانا حالیؔ نے لکھا ہے۔ ان کے کلیات میں غزلیات کے علاوہ ۱۶۲ رُباعیاں، ۹ مخمس، ۸ قصائد، ایک واسوخت۔ متعدد قطعات ترجیع بند، ترکیب بند اور ۱۸۶ بند کا طویل مرثیہ ہے۔(۱) انھوں نے بعض انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے بھی کیے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں منشی گلاب سنگھ مشتاق مشہور ہیں۔(۲) قلقؔ کو قیام دہلی کے زمانے میں مومن خاں سے تلمذ ہوا۔ چنانچہ حالیؔ مقدمہ کلیات قلقؔ میں لکھتے ہیں :۔

"دارانِ ایام کہ گلشن دہلی را آخر فصل بہار بود جمعے از گراں مایگان عالمِ معنی و چابک خراماں عرصہ سخن چوں غالبؔ و ذوقؔ و مومن سائرین کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :۔ فائق نے ۱۸۳۲ء لکھی ہے۔ حسرت موہانی نے ۱۲۵۰ء تحریر کی ہے۔ میری تحقیق ہے کہ ان میں سے کوئی درست نہیں ہے
(قلق میرٹھی۔ حیات اور کارنامے)

(۱) اُردوئے معلّٰی (رسالہ) حسرتؔ موہانی جنوری سنہ ۱۹۱۱ء

(۲) " " " (بحوالہ مقدمہ کلیات قلقؔ) جنوری ۱۹۱۱ء

درسخنوری ونکتہ پروری فخرِ دہلی بل نازش ہندوستان بودند۔ دریں معمورہ جا واشتند۔ واز فیض وجود ایشاں عالمے را ہوئے شعر و سخن در سر افتادہ بود ورحکیم مغفور کہ باموزونی طبی وجودت ذہن فکرے عمیق و نظرے دقیق داشتہ۔ باوجود مشاغل علمیہ نتوانستند خود را ازیں بادہ مرد افگن نگاہ دارند۔ لاجرم داعیہ غزل سرائی در خاطر ایشاں پدید آمد۔ مومن را بہ استادی برگزیدند و رفتہ در خاطر استاد موقع قبول یافتند۔" (۱)

خدا نے طبیعت میں قناعت پسندی اور بے نیازی دی تھی۔ چنانچہ جب میرٹھ سے واپس آئے تو زندگی کا بقیہ حصّہ فارسی کا درس دینے میں گزارا۔ اس سے جو قلیل آمدنی ہوجاتی اس پر توکل کرتے۔

"دربعضے مدارس دولتی خدمت درس فارسی بہ ایشاں تعلّق داشت کہ وجہ معاش و سامان قوّت لایموت ایشاں بود۔" (۲)

قلق نے اکثر غزلیں مومن کی دشوار گزار زمینوں میں لکھی ہیں۔ جہاں ان سے ان کی قادرالکلامی ظاہر ہے۔ وہاں اس رنگِ شاعری نے ان کے کلام میں بے کیفی پیدا کردی۔ الفاظ نورنگین و شادابی مضمون ان کے کلام کی جان ہے۔ مومن کے کلام میں جو ترکیبیں ملتی ہیں وہ قلق کے یہاں بھی موجود ہیں۔ لطف یہ ہے کہ قلق جہاں مومن کے کلام کی خوبیوں میں شریک ہیں وہاں ان کی خامیوں میں بھی شریک نظر آتے ہیں۔ مشکل پسندی غرابت الفاظ ترکیب کی کثرت کلیات قلق میں بھی ملتی ہیں۔ چناں چہ جگہ جگہ بندشوں کی کمزوری اور صحتِ الفاظ کی طرف سے بے توجہی برتی گئی ہے۔

جبین پارسا کو دیکھ کر ایماں لرزتا ہے
معاذاللہ کہ کیا انجام ہے اس پارسائی کا

محبّت میں کہاں شرکت گوارا
اُٹھائے نالہ کیوں تہمت اثر کی

---

(۱) اردوئے معلیٰ (رسالہ) حسرت موہانی جنوری سنہ ۱۹۱۱ ء
(۲) " " " " " "

دیکھو ستم ظریفی دود دل و جگر کی
اِک آسماں کو پھُونکا اِک آسماں بنایا

کچھ تماشا ہے کھیل ہے کیا ہے
اک زمانہ کو قتل کر بیٹھے

پڑتی ہے آنکھ اس کی مرے حالِ زار پر
لو میں بھی چڑھ گیا نظر روزگار پر
جیتے رہے ہیں مردن دُشوار کے لیے
مرتے رہے ہیں عمر بھر انداز یار پر
وہ حال مرا دیکھ کے کچھ سرخ رو ہوئے
کیا جانے کیا بنی نگہ شرمسار پر

قلق کیوں چھوڑتا دہلی کو کیوں میرٹھ میں آ رہتا
گدائی کے بھروسہ پر لٹایا بادشاہی کو

کس کی نظر سے سیکھے انداز یہ قلق نے
اس سادہ گو کو کس نے جادو بیاں بنایا

ہے ہمیں ضبط قلق کا ماتم
آہ بھی اے دلِ ناچار نہ کھینچ

موسیٰ کا کیا قصور ہے پوچھ اپنے شوق سے
وعدے کا تیرے تجھ سے تقاضا ضرور تھا

دیرینہ رفیق تھا قلق ہائے
وہ کیا ہے مرا کہ مر گئے ہم

اور بھی اب مزاج دل بگڑا
وہ جو پہلو میں آن کر بیٹھے

مرثیے کا ایک بند سُنیئے :-

جب صبح کربلا میں وہم کی ہوئی نمود
جائے شفق ملک سے عیاں تھا ہجوم دود
کرنا نگاہ نور سے تھا مہر کا سعود
ہر ذرّہ خیر سے تھا خال رُخ ہنود
تھا نُور دُور مہر سے اور مہر نُور سے
خود کو ٹٹولتا تھا ہر ایک قرب و دُور سے (۱)

قیصر ــــ مرزا خدا بخش

مرزا خدا بخش قیصر شاہ عالم بادشاہ کے نواسے تھے اور مصنّف گلستانِ سخن مرزا قادر صابر کے ماموں تھے۔ خاندان شاہی سے تعلق رکھتے تھے اور اس کے باوجود مزاج میں انکسار اور فروتنی تھی۔ مشاعرہ کا خاص شوق تھا۔ چناں چہ جب تک ہوش و حواس قائم رہے مشاعرہ کرتے رہے۔ خاندان شاہی کا عام طور سے رجحان ذوق کی طرف تھا، مگر قیصر نے اِس روایت کے خلاف مومن کی شاگردی اختیار کی۔ غدر میں بے حد سن رسیدہ اور معمّر ہو چکے تھے۔ عمر کی اس منزل کو پہنچ چکے تھے کہ ان پر بغاوت میں کسی قسم کی شرکت کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر ان غریب کو بھی سازش کے جُرم میں انگریزوں نے پھانسی دے دی۔

---

(۱) جلوہ خضر ص ۲۴۵۔ سخن شعرا ص ۳۵۰۔ اُردو معلّیٰ حسرت موہانی جنوری ۱۹۱۱ء۔ گلستان سخن ص ۳۹۸

کریں گر کلفتِ دل کا بیاں ہم
ملا دیں خاک میں ہفت آسماں ہم

اس کوچہ میں خاک ہونے کا چرچا ہے جا بجا
نام اپنا جب ہوا کہ رہا کچھ نشاں نہیں

ہوس غیر سے عشق اپنا اسے یاد آیا!
کیا نئی طرح سے ہم دل میں گزر کرتے ہیں

تو لطف کرے یا نہ کرے خوش ہو کہ یا ناخوش
اس بات پہ مرتا ہوں کہ عاشق ہوں ترا میں

جنوں میں بھی مری شوکت نہیں جاتی ہے اے قیصر
جہاں جاتا ہوں مرے ساتھ اب لڑکوں کا لشکر ہے (۱)

کاظم —— کاظم علی کاظم منڈ اور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ مومن کے قدیم تلامذہ میں سے تھے۔ ان کا حال تذکروں میں نہیں ملتا۔ البتہ چند تذکروں میں ان کا نام مل جاتا ہے۔ ان کا کلام بھی دستیاب نہیں ہوتا۔

اے طفل اشک ہم تھے آنکھوں میں یوں رکھیں
اور تو ہمارے راز کو یوں برملا کرے

شبنم رخ گل پر نہیں کاظم یہ سحر کو
پھوٹا ہے کوئی پائے عنادل کا پھپھولا (۲)

---

(۱) طور کلیم ص ۸۲ ۔ سخن شعرا ص ۳۹۴ ۔ گلستان سخن ص ۵۰۴
(۲) حاشیہ اگلے صفحہ پر

کرم ـــــ غلام ضامن۔ کرم کا ذکر تو اکثر تذکروں میں ملتا ہے۔ مگر شیفتہ کی گلشن بے خار سے زیادہ معلومات کہیں فراہم نہ ہوسکیں۔ وہ لکھتے ہیں :۔

" غلام ضامن اصلش از کوتانہ بالفعل در شاہجہاں آباد بسر می بود، مدتہا در حیدر آباد گزرانید۔ در ریختہ و فارسی فکر کنند۔ قوت تطبیہ بسیار دارد۔ زانوئے ادب بہ خدمت مومن خاں تہ کردہ۔ باوجود کہن سالی مرد شگفتہ و ظریف است و بارا قم آشنا است "

کرم کا انتقال بھوپال میں ہوا۔ اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے :۔

فرہاد و قیس عشق میں سرگرم لاف تھے
خاموش ہو گئے جو مرا نام آگیا

نام کب آسودہ جانیں لیں نالہ ہائے زار کا
سرمۂ آواز ہے سایہ تری دیوار کا

اے طفلِ اشک دیکھ کر برباد کیجیو
ہر پارۂ جگر ورق انتخاب ہے

گر وہاں بیٹھوں تو اُٹھے وہ مری تعظیم کو
خوف ہے شاید کہ صحبت کا اثر ہونے لگے

وائے قسمت اور اخفا ہی ہوا افشائے راز
روکتے ہی اشک کے لختِ جگر آنے لگے

حاشیہ صفحہ گزشتہ ۔ (۲) بزم سخن ص ۸۹ جلوۂ خضر ص ۲۴۵۔ حیات مومن ص ۷۷۔ گلستان سخن ص ۴۰۶
(۳) نگار میں امتیاز احمد نے ان کو دہلوی لکھا ہے ص ۷۹۔ اور گلشن بے خزاں میں ان کو پامودی لکھا ہے ص ۱۹۶

اس کو شہرت کی تمنّا مجھے رُسوائی کی
ہر کوئی آرزوئے نشو و نما رکھتا ہے

ہاتھ ہووے گا مرا اور ترا داماں ہوگا
چاک جب صبحِ قیامت کا گریباں ہوگا

زُلف مژگاں سے لپٹتی ہے خدا خیر کرے
مشک آلودہ کہیں خنجر ہوگا

تیر ناخوردہ ہما رشک سے کیا کیا تڑپا
استخوانوں میں مرے دیکھ کے پیکاں تیرا
کیا ہی برہم ہوئی زُلف اس نے جو پوچھا مجھ سے
اے کرم کس نے کیا حال پریشاں تیرا

میرا نشو و نما ہے اس خرام لاؤ بالی سے
غبار ناتواں کو سرکشی ہے پائمالی سے

نسبت ہے میرے داغ سے کیا عندلیب کو
گو آہ سرد و باد سحر دونوں ایک ہیں (۱)

مسکینؔ — عبدالوحد — متوفی ۱۸۵۴ء / ۱۲۷۱ھ "مسکینؔ تخلص سید

---

(۱) جلوۂ خضر ص ۲۴۵۔ طبقات الشعرائے ہند ص ۳۸۱۔ گلشن بیخارہ ص ۱۶۱۔ سخن شعرا ص ۲۹۷۔ گلستانِ بے خزاں ص ۱۹۶۔ بزمِ سخن ص ۹۸۔ خوش معرکہ زیبا (قلمی) ص ۔ ۱۲۲۔ طور کلیم ص ۸۲

عبدالواحد خاں جوانے حریف و ظریف است۔ ہنگام ورود دہلی سخن
کہ می گفت بر مومن خاں می خواند و نیز با فیفر ربطے پیدا کردہ بود۔"(۱)

یہ الفاظ گلشن بے خار کے ہیں۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں ان کے متعلق سعادت علی ناصر لکھتے ہیں :-

"سزاوار آفریں و تحسین عبدالوحد خاں تخلص مسکین شاگرد مومن خاں۔"(۲)

وطن کے متعلق مصنف سخن شعرا نے ان کو خیر آبادی لکھا ہے(۳) اور آثار الشعرا میں ان کو اکبر آبادی بتایا گیا ہے(۴)، وطن کو چھوڑ کر انھوں نے دہلی میں قیام کیا اور مومن خاں کی شاگردی اختیار کی۔ آخر کار بھوپال چلے گئے۔ وہاں ۱۸۵۴ء/۱۲۷۱ھ میں انتقال ہوا اور تکیہ دلاور شاہ واقع بھوپال میں دفن ہوئے(۵)، نساخ نے لکھا ہے کہ انھوں نے ایک دیوان اور مثنوی چشمہ شیریں یادگار چھوڑی۔ ان کا دیوان مطبع سکندری بھوپال سے ۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ میں شائع ہوا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

کیوں نہ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو اس رنجور کا
جس کو از خود رفتگی ہے اک سفر ہے دور کا

لے گئی چھین کے دل ساقی سرشار کی آنکھ
آ گئی دیکھ جسے نرگس بیمار کی آنکھ

سر بسر لاتی ہے میری جان پر لاکھوں وبال
خواب میں بھی اس کی گر زلف پریشاں ہو گئی

---

(۱) گلشن بے خار ص ۱۷۶

(۲) خوش معرکہ زیبا ص ۱۳۲۰۰ (۳) سخن شعرا نساخ ص ۴۳۳ (۴) آثار الشعرا حافظ ممتاز علی ص ۲۰۶ (۵) طبقات الشعرا ص ۳۰۸۔ گلشن بے خار ص ۱۷۶۔ سخن شعرا ص ۴۳۳۔ آثار الشعرا ص ۲۰۶۔ خوش معرکہ زیبا (قلمی) ص ۱۳۲۰۰

مضطر — مرزا سنگین بیگ —

"اسمش مرزا سنگیں بیگ۔ شخصے است۔ ذہین و خوش اختلاط بافقیر تعارفے دارد، و قسمے از ملاقات در چند زمین تخمے افشاندہ بود ایں ثمر است "(۱)

دہلی کے باشندہ تھے۔ خاندان تیموریہ سے ان کا سلسلۂ نسب تھا۔

تھا خود وہ تڑپنے سے خجالت زدہ ہم تو
مضطر کے کبھی خون کا دعویٰ نہ کریں گے

کیا کیا دست جنوں پہ تری بے جانی نے
مَیں تو خوش تھا کہ کفن میں بھی گریباں ہوگا (۲)

ملال — محمد حسین زیدی — متوفیٰ ۱۹۱۱ء / ۱۳۲۰ھ

سید محمد حسین زیدی نام۔ ملال تخلص۔ درسیہ کتب اپنے والد — سید فیاض علی سے پڑھیں اور حدیث کا درس اس زمانے کے مشہور محدث مولوی نذیر حسین صاحب سے لیا۔ جب خاندان دَرد سے تعلق پیدا ہوا تو سلوک محمدیہ نقشبندیہ کو اپنے خسر میر امام الدین ناصری سے حاصل کیا۔ خط نستعلیق کا فن اپنے والد اور والد کے اُستاد میر پنجہ کش سے سیکھا۔ فن موسیقی میں اس زمانے کے مشہور میر ناصر احمد کے شاگرد تھے اور اس میں وہ ملکہ بہم پہنچایا کہ اس زمانہ کے مشہور بین بجانے والے دنگ رہ جاتے۔ فارسی اور اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام اپنے والد سید فیاض علی کو اور اُردو کا کلام حکیم مومن خاں کو دکھاتے۔ خواجہ

---

(۱) گلِ بے خار ص ۱۸۲۔

(۲) جلوہ خضر ۲۴۵۔ طبقات الشعرائے ہند ص ۳۸۶۔ گلشنِ بے خار ۱۸۲۔ سخن شعرا ۴۲۳۔ گلستان سخن ۴۲۸

ابتدائیہ

ایک استاد کا کمال یہ ہے کہ جو تلامذہ اس کے حلقۂ اثر میں ہوں ان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لے۔ دوسرے الفاظ میں وہ محض کامل ہی نہ ہو بلکہ کامل گر بھی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ مومن کے بعض تلامذہ نے ان سے اس قدر مماثلت بہم پہنچائی ہے کہ ناواقف آدمی شبہ میں پڑ جاتا ہے راقم نے مومن کی شاعری کے اس پہلو کو جس کی طرف سے عموماً بے توجہی برتی گئی ہے۔ خاص طور پر نمایاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ انہوں نے اپنے تلامذہ خصوصاً شیفتہ، تسکین، برق اور قلق کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ ان کے لب و لہجہ میں مومن کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی ہے۔ ان حضرات نے نفس تغزل، خیال کی نزاکت اور تراکیب کی ندرت میں اُستاد کے رنگ کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔

دبستانِ مومن کا تجزیہ کرتے ہوئے راقم نے ہیئت اور موضوع کا باہمی ربط الفاظ کی اہمیت اور مسئلہ پر قدیم و جدید اہلِ فن کے نقطۂ ہائے نظر سے بحث کی ہے۔ شاعری کے لیے ہیئت کی ضرورت سے کوئی ذی فہم انکار نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ مواد بغیر ہیئت کے تشکیل پا ہی نہیں سکتا اور اگر محض ہیئت پر اکتفا کیا جائے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ کیوں کہ ہیئت لامحالہ مواد کا مستلزم ہے۔ لیکن پھر یہ بحث رہ جاتی ہے کہ دونوں میں زیادہ ضروری عنصر کون سا ہے۔ اس بارے میں ہمیشہ دو رائیں رہی ہیں۔ ایک فریق مواد کو اور دوسرا ہیئت کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس میں نہ صرف قدیم و جدید اہلِ فن میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے بلکہ قدیم علمائے بلاغت بھی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ اگرچہ علامہ شبلی نے الفاظ کو زیادہ اہم ٹھہرایا ہے اور ان کے برخلاف جدید ناقدین موضوع کی اہمیت کے قائل ہیں۔ لیکن راقم کی رائے میں ایک شاعر یا ادیب دونوں میں

میر دردؔ کی رعایت سے اپنا تخلص ملالؔ رکھا۔ غدر سے قبل دو دیوان (فارسی اور اُردو) کے مرتب کیے جو غدر کے ہنگامے میں برباد ہو گئے۔ پھر کبھی شعر نہیں کہا۔ اگر کوئی اصرار کرتا تو کہتے کہ "شعر و شاعری کا لطف لال قلعہ اور شہر کی آبادی کے ساتھ گیا۔ کہاں جا کر غزل پڑھیں اور کسے سُنائیں۔

آخر یکم رجب ۱۳۰۰ھ کو رحلت فرمائی۔ (۱)

موجدؔ ـــــ حشمت علی خاں ـــــ ولادت ۱۸۳۵ء / ۱۲۵۰ھ

حشمت علی خاں ولد محمد سعادت علی خاں ریاست رام پور میں عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے۔ انتخاب یادگار کے وقت ان کی عمر چالیس برس کی تھی (۲) جس سے ظاہر ہے کہ ان کی ولادت ۱۲۵۰ھ میں ہوئی ہوگی۔ بقول امیر مینائی "مرد خوشرو ہیں، جوان خوش خو ہیں۔ مذاق عاشقانہ ہے، ہر مضمون یگانہ ہے۔ مومن خاں سے تلمذ ہوا۔ ان کا ایک مجموعہ مطبع احمد کان پور سے ۱۸۹۲ء / ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوا۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔ بہار کی صفت میں لکھتے ہیں :-

ہے اب کے سال یہ فصلِ بہار عالم گیر
کہ خود بخود ہے نوا سنج بلبل تصویر
ہر اک روش روشِ کہکشاں ہے رونق خیز
ہر اک چمن چمنِ باغ خلد کی ہے نظیر

رسول اکرمؐ کی شان میں لکھتے ہیں :-

خدا نے بخشی ہے ہاں در کو اس کے یہ تاثیر
کہ خاک واں سے اُٹھا لیجیے تو ہو اکسیر
کہاں یہ علم کہاں یہ فصاحت تقریر
کہ نظم سحر ہے اس کی تو نثر ہے تسخیر

---

(۱) میخانۂ درد ص ۲۳۰ تا ۲۳۲ (۲) انتخاب یادگار ص ۳۶۸

غزل کے اشعار ہیں :۔

کل تو حیلہ حنا کا ہاتھ آیا
عذر آنے میں آج کیا ہوگا
ہائے تیرے مریض کا کہنا
اب وہ آئیں گے بھی تو کیا ہوگا

کبھی کہتے ہیں عبث جان گئی موجد کی
کبھی کہتے ہیں مرا ناز اُٹھایا نہ گیا

ان کے چلمن میں لگا ئیں ہائے خس کی تیلیاں
کیوں نہ بنوائیں مرے تارِ نفس کی تیلیاں

دلوں کی یہ ترقی یہ ہجوم خواہش
ایک بوسہ پہ ہو کس طرح قناعت مجھ کو

اپنی اُلفت پہ ناز ہے ہم کو
کہ انہیں بھی وفا کیے ہی بنے

ہوا یہ حوصلہ موجد کو بھی خدا کی شان
گئے ہیں آج عرضِ مدعا کے لیے

کہاں میں اور کہاں ترکِ محبت
نصیحت کی بھی ناصح نے تو کیا کی

چشمِ تر کا بھی ہو رہے گا علاج
پہلے کر فکرِ چارہ جو دل کی

بے پردہ وہ بیٹھے ہیں اُٹھائے ہوئے چلمن
اے حسرتِ دیدار کچھ اس کی خبر بھی ہے

اتنی ہی دعا میں مری تاثیر ہو یارب
جتنا کہ ہر اک بات میں دشمن کی اثر ہے (۱)

ناظم ـــــ نواب یوسف علی خاں ـــــ ولادت ۱۸۱۴ء / ۱۲۳۰ھ
وفات ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۲ھ

شعر و ادب کے سلسلے میں جو خدمات رام پور کی ہیں وہ کم ہی ریاستوں کے حصّے میں آئی ہیں۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجیے کہ شعر و ادب میں خود والیانِ ریاست نے جو حصّہ لیا وہ شاید ہی کسی اور ریاست کو میسّر ہوا ہو۔ خاندانِ شاہی (ریاست) میں متعدد لوگوں نے شعر کہے اور اساتذۂ وقت کے شاگرد ہوئے۔ اس میں اہم کڑی نواب یوسف علی خاں ناظم ہیں۔ جو شعر کہنے کے علاوہ نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس بھی تھے۔ شعرا اور ادبا کی سرپرستی کی۔ غدر کے ہنگاموں میں جب لکھنؤ اور دِلّی کی بساط اُلٹ گئی جو ایک دفعہ پھر دِلّی کی فضا رام پور میں پیدا ہو گئی۔ رام پور ایک مرکز تھا جہاں دِلّی اور لکھنؤ کے اربابِ علم و فن دادِ کمال دے رہے تھے۔

نواب یوسف علی خاں نواب محمد سعید خاں ۱۸۱۴ء مطابق ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد نواب محمد سعید خاں کے انتقال کے بعد ۱۲۷۱ھ میں جلوس کیا۔

---

(۱) انتخاب یادگار ص ۳۶۷

ان ہی کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کا حادثہ پیش آیا۔ چونکہ سرکار انگلشیہ میں خاص رسوخ حاصل تھا اس لیے سرکار انگریزی سے صلہ خیر خواہی میں ایک لاکھ روپیہ روپیہ کی جاگیر اور ستارہ ہند کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

علوم وفنون سے خاص رغبت تھی۔ کاملوں اور عالموں سے صحبت رہتی تھی۔ علوم عقلیہ اور نقلیہ۔ منطق وحکمت میں خاص دستگاہ تھی۔ ان کے استادوں میں مولانا فضل حق خیر آبادی مولانا صدرالدین آزردہ اور ملا غیاث الدین (مؤلف غیاث اللغات) تھے۔ پستول کا نشانہ بہت اچھا لگاتے تھے۔(۱)

ان کا حلیہ سنیے:

> داڑھی مونچھیں مُنڈا کر صفا چٹ رہتے تھے اور رُخسارے میدان لق ودق نظر آتے تھے۔ حالاں کہ نواب بہت سجیلے جوان اور دیدار رو تھے مگر داڑھی رکھتے تو خوبصورتی تصویر کا عالم دکھاتی۔(۲)

ناظم کی شاگردی کے سلسلے میں نہایت دل چسپ قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ مثلاً مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا خیال ہے کہ ناظم صرف غالب اور اسیر کے شاگرد تھے اور وہ اپنے دعوے کی دلیل میں ناظم کا خط جو انھوں نے مرزا غالب کو بھیجا تھا پیش کرتے ہیں۔ یہ خط مکاتیب غالب مرتبہ عرشی میں موجود ہے، اور ۵ فروری ۱۸۵۷ء کا لکھا ہوا ہے:-

> "مشفقانہ ہر چند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ ہم نہ شدہ بود۔ لیکن محض بجہت سماعت کلام سامی زبانی مولوی صاحب صدرالوصف ولم خواست کہ طریقہ رسل ورسائل جاری شود۔ چوں بسیلے بہ ازیں بنظرم نہ رسید۔ لہٰذا چند ابیات واہیات موزوں نمودہ۔ بتوصد اصلاح

---

(۱) اخبارالصنادید حصہ دوم ص ۱۲۴

(۲) " " " نجم الغنی ص ۱۲۴

پیش آں یگانہ آفاق مرسل گشت چشم داشت کہ بعد اصلاح غزلہائے مذکور مع کدام طرح جدید لطف فرمودہ شوند۔"(۱)

مگر امیر مینائی کا قول اس کے برخلاف ہے وہ یادگار انتخاب لکھتے ہیں :۔

"سخن گوئی کا ذوق اُردو شعر فرمانے کا تھا۔ پہلے مومن خاں صاحب سے مشورہ رہا۔ پھر مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ ہوا۔ آخر بوضع اُستادانِ لکھنو موزوں فرمانے لگے۔ منشی مظفر علی صاحب کو کہ آج لکھنؤ سبحان عصر یکتائے دہر ہیں کلام دِکھانے لگے۔"(۲)

یہ دونوں بیان متضاد ہیں۔ ناظم کا یہ کہنا ہے کہ

"ہر چند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ نہ شدہ بود۔"

اور امیر مینائی کا یہ بیان کہ "پہلے مومن خاں صاحب سے مشورہ رہا۔" اشتباہ میں ڈالتے ہیں۔ ناظم کے شاگرد مومن نہ ہونے کی تائید میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناظم نے شاگرد غالب ہونے کا ذکر تو اپنے کلام میں کیا ہے مگر مومن کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن راقم کے نزدیک یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ وجوہ حسبِ ذیل ہیں :۔

۱۔ امیر مینائی خود اس زمانے میں موجود ہیں جو زمانہ نواب یوسف علی خاں کا ہے اور وہ ایک ثقہ اور معتبر آدمی ہیں۔ تذکروں کے سلسلے میں ان کے انتخاب یادگار کو مستند خیال کیا جاتا ہے۔

۲۔ ناظم ۱۸۵۷ء میں غالب کے شاگرد ہوتے ہیں اور اس کے چار سال بعد ۱۸۶۱ء میں ان کا دیوان غالب کی اصلاح کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اس چار سال میں ایک دیوان کا مکمل ہو جانا اور پھر اندازِ بیان میں کافی حد تک پختگی کا ہونا ذہن میں دو سوال پیدا کرتا ہے۔ اوّل یہ کہ یا تو وہ کلام ناظم کا نہیں بلکہ غالب نے لکھ

---

(۱) مکاتیبِ غالب۔ مرتبہ عرشی رام پوری۔ ص ۳

(۲) یادگار انتخاب ص ۱۷

کر ان کو دے دیا۔ اس شبہ کا بطلان اس بات سے ہوتا ہے کہ کتب خانہ رام پور میں غالبؔ کا اصلاح شدہ دیوان ناظم موجود ہے اور جو اشعار مرزا کو پسند آئے ہیں ان پر نشان (ص) بنا ہوا ہے۔ پھر دوسرا سوال رہ جاتا ہے کہ اس قلیل مدت میں اتنا وافر ذخیرہ کیونکر تیار ہو گیا۔ اس کا یہی جواب ہو سکتا ہے کہ وہ غالبؔ کے تلمذ سے پیشتر بھی شعر کہتے تھے اور ان کا یہ فقرہ کہ میں نے پہلے کبھی "مصرع تک موزوں نہیں کیا" محض انکساری پر مبنی تھا۔

۳۔ غالبؔ مرزا غوث بے خبر کو لکھتے ہیں :۔

"۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رام پور میرے آشنائے قدیم ہیں۔ اس سال (یعنی ۱۸۵۵ء میں) میرے شاگرد ہوئے۔ ناظمؔ ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے ہیں۔ میں اصلاح دے کر بھیج دیتا ہوں۔" (۱)

اس خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناظمؔ کے پاس پہلے سے غزلیں موجود تھیں اور "مصرع موزوں" نہ کرنے کی بات محض "اندازِ بیان" پر محمول کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ۵۷ء اور ۵۵ء کا تضاد بھی ملحوظ رہے۔

ہماری اوپر کی بحث سے یہ ثابت ہو گیا کہ ناظمؔ پہلے سے شعر کہتے تھے۔ اب اس دعوے کو امیرؔ مینائی کے قول کی روشنی میں پرکھیے :۔

" پہلے مومنؔ خاں صاحب سے مشورہ رہا۔ پھر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ سے تلمذ ہوا۔" امیرؔ مینائی کے علاوہ گُلِ رعنا اور تاریخِ ادب اُردو نے بھی ناظمؔ کو مومنؔ کا شاگرد تسلیم کیا ہے۔ (۲)

اگرچہ مولانا عرشیؔ نے ان کو صرف غالبؔ اور اسیرؔ کا شاگرد مانا ہے(۳)۔ ناظمؔ

---

(۱) اردوئے معلیٰ ص ۴۷۵

(۲) گُلِ رعنا ۳۱۳ (حاشیہ) تاریخ ادب اردو عسکری ۱۴۱ ؛ اخبار الصنادید حصہ۲ ص ۱۲۵۔ نجم الغنی

(۳) مکاتیب غالبؔ (مرتبہ مولانا عرشی) مقدمہ ص ۴۷

نے غالبؔ کی شاگردی کا اعتراف اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔

ناظمؔ ہمیں متبعِ غالبؔ پہ ناز ہے
ہوگا کسی کو پیرویِ میرؔ پر گھمنڈ

کیوں نہ غالبؔ کے ہوں اشراق کا قائل ناظمؔ
دُور سے جس نے سکھایا مجھے ایسا کہنا

ناظمؔ کا دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۶۱ء/۱۲۷۸ھ میں غالبؔ کی اصلاح کے بعد شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسرے ایڈیشن میں اسیرؔ کا دیکھا ہوا کلام بھی شامل کر دیا گیا۔(۱)

ناظمؔ کے کلام میں لطیف استعارے، رنگین تشبیہیں اور نازک خیالات ہیں۔ غالبؔ اور اسیرؔ کی اصلاح نے اور چار چاند لگا دیے۔ ناظمؔ کے کلام پر غالبؔ کا رنگ ہے۔ مگر زیادہ چھاپ لکھنؤ کی معلوم ہوتی ہے۔

ناظمؔ کا انتقال مرض سرطان میں ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ امیرؔ مینائی نے تاریخ نکالی:

ع مسند آرائے جناں شد یوسف دورانِ من

نمونۂ کلام یہ ہے:

غصّہ میں کہا ہوگا ہم کچھ نہ سُنیں گے
گر آپ سُنیں گے تو میں سو بار کہوں گا

مَیں نے کہا کہ دعوئے اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط
ہاں سینے سے نمایش داغِ دروں دروغ
ہاں آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر غلط

---

(۱) انتخاب یادگار ص ۷۰

سوزِ جگر سے ہونٹ پہ بتخالہ افترا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و دَر غلط

ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر بزم میں سب نے اسے چلتے دیکھا
واعظ و شیخ بھی کیا خوب ہیں کیا بتلاؤں
میں نے میخانہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا

کیوں آکے کہوں در پہ کہ وہ گھر میں نہیں ہیں
کیا ہم نہیں پہچانتے سرکار کی آواز

ترے گھر وہ آئے ناظم تو یہ اضطراب کیا ہے
کوئی بادشاہ آیا کوئی شہریار آیا

کہتے ہو کہ ہم غیر کو آنے نہیں دیتے
سچ ہو یہی پر میں نے سُنا اور ہی کچھ ہے

ہونے دیا نہ شاد یہ دن پھر کہاں مجھے
ہے ہے تمھیں رقیب کے مرنے کا غم ہوا

وہی تم ہو وہی خنجر ہے پر انصاف کرو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

کیا تم نہ جانتے تھے کہ بے خانماں ہوں میں
پھرتا ہے نامہ بر مرا گھر پوچھتا ہوا

معتقد ہوں کعبہ کا، ناظم مگر جا کر وہاں
عبرت آتی ہے کہ کیا بُت خانہ ویران ہو گیا

جو کہیے، دردِ دل سُنیے، تو کہتے ہیں کہ "ہاں کہیے
اسی کو دردِ دل کہتے ہیں جو گفتار میں آئے"

سب کے اس عمر میں ہو جاتے ہیں ایسے ہی حواس
تجھ سے کچھ شکوہ مجھے، ایک فلک پیر نہیں

ستم میں شہرہ جو وہ آفت زمانہ ہوا
فلک کو عذرِ ستم کے لیے بہانہ ہوا

اگرچہ خوش ہوں، پر آتا ہے رحم بھی تم پر
کہ مجھ سے غم زدہ کو غم گُسار سمجھے ہو (۱)

نسیم — اصغر علی خاں — وِلادت ۱۷۹۹ء / ۱۲۱۴ھ وفات ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۲ھ

اصغر علی خاں نام تھا اور نسیم تخلص۔ ان کی وِلادت دہلی میں ۱۷۹۹ء میں ہوئی۔ نسیم کے والد کا نام نواب آقا علی خاں تھا۔ ان کا شمار دہلی کے رؤسا میں ہوتا تھا۔

---

(۱) انتخاب یادگار ص ۷۰۔ اخبار الصنادید ص ۱۲۴۔ تلامذہ غالب ص ۲۷۱۔ بیاض سخن ص گل رعنا ص ۳۱۳۔ بزم سخن ص ۱۱۱۔ مکاتیب غالب مرتبہ مولانا عرشی (دیباچہ) ص ۷۴۔ تاریخ ادب اردو ص ۱۱۴

کسی سے قطع نظر نہیں کر سکتا۔ اچھا شعر یا اچھا ادب اس کا متقاضی ہے کہ حسنِ معنی کے ساتھ حسنِ بیان کا بھی حامل ہو اور دونوں کے لطیف امتزاج پر کسی شعر یا ادب پارے کی جمالیاتی حیثیت موقوف ہے۔

آخر میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تلامذہ مومن میں کچھ ایسے منتخب افراد بھی تھے جنھوں نے اپنے استاد کے اسلوب پر متعدبہ اضافہ کیا ہے۔ جن میں شیفتہ، برق، سالک، ظہور نسیم کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ہمارے خیال میں وہ خصوصیات جن کا ان تلامذہ کے یہاں اضافہ ملتا ہے حسب ذیل ہیں۔

تصوف اخلاقیات سلاست اور صفائی اول الذکر دونوں کے بارے میں عرض یہ کرنا ہے کہ مومن نے بالقصد ان موضوعات سے اجتناب کیا ہے۔ وہ مذہبِ تصوف کو شجرِ ممنوع خیال کرتے تھے۔ رہی سلاست اور صفائی وہ بھی مومن کے مقابلے میں ان حضرات کے یہاں زیادہ ہے۔ مومن معنی آفرینی کے شوق میں زبان کی صفائی کا چنداں خیال نہیں کرتے اس لیے کہیں کہیں ان کے اشعار میں پڑھنے والے کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ اس کے برخلاف ان کے تلامذہ کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ یوں بھی جتنا زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے زبان منجھ کر شستہ اور رفتہ ہوتی جاتی ہے۔

راقم الحروف نے معاصر اور قریب العہد تذکروں مثلاً گلشن بے خار۔ شمع انجمن، طور کلیم، خوش معرکۂ زیبا، گلستان سخن، طبقات الشعرائے ہند اور بہار بے خزاں وغیرہ کی جستجو اور ورق گردانی کر کے مومن کے چوالیس (۴۴) تلامذہ کے نام، ضروری حالات نمونے کے ساتھ شامل کر دیئے ہیں۔ ان میں متعدد شاگرد بجائے خود استادی کے مرتبہ پر فائز ہیں۔ بعض ایسے شعرا بھی ہیں جو پہلے مومن کے دامن تربیت سے وابستہ رہے اور مومن کی وفات کے بعد غالب کے رشتۂ تلمذ میں منسلک ہو گئے۔ مثال کے طور پر شیفتہ، خورشید، سالک وغیرہ کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں کامل یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ تلامذۂ مومن کے نام اور حالات محفوظ کرنے کی پوری کوشش اب تک نہیں کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور کے تلمذ کا مسئلہ بھی سامنے آیا ہے اور راقم نے ثابت کیا ہے کہ موصوف اولاً مومن کے شاگرد تھے اور مومن

والد کے انتقال کے بعد بھائیوں سے نااتفاقی ہوگئی اور نسیمؔ نے دہلی سے لکھنؤ کا رخ کیا اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ نسیمؔ نے دلی میں پرورش پائی اور یہیں حکیم مومنؔ خاں کے شاگرد ہوئے اور اصغرؔ تخلص رکھا۔ بعد کو نسیمؔ اختیار کیا۔ اپنے دہلی کے قیام کے زمانے میں بہت خوش حالی اور فراغت سے گزاری۔ جب لکھنؤ آئے تو کافی عسرت تھی مگر خودداری اور غیرت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری میں حسرتؔ موہانی کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔

نسیمؔ اکثر احباب کے ساتھ چوک کی طرف سے گزرا کرتے تھے۔ ایک دن خلافِ معمول راستہ گلیوں میں سے اختیار کیا۔ لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو بڑے اصرار کے بعد بتایا کہ میری جیب کئی روز سے خالی ہے۔ خیال ہوا کہ اگر چوک کی طرف سے گیا اور کسی ضرورت مند نے دستِ سوال دراز کیا تو کیا جواب دوں گا۔(۱)

بھائیوں کو ان کے لکھنؤ جانے کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہوا تو معذرت کے ساتھ پانچ سو روپیہ روانہ کیا کہ واپس آجائیں۔ مگر جو قدم ایک دفعہ اُٹھ چکے تھے واپس نہ آئے۔(۲) اور قاصد روپے کے ساتھ بے نیل مرام واپس ہوا۔

نسیمؔ نے عربی اور فارسی کا بہت اچھا مطالعہ کیا تھا۔ خوش نویسی کے ماہر تھے۔ وہ بڑے وسیع المطالعہ و وسیع النظر تھے۔ چناں چہ مشہور ہے کہ مومنؔ کے پاس ایک بیاض تھی جس میں عروض کے اقتباسات اور اپنی شاعری کے متعلق بڑے نادر نکات درج تھے۔ ایک مرتبہ موقع پاکر نسیمؔ نے وہ بیاض چوری سے نقل کی اور بعد کو مومنؔ سے معذرت کر لی۔ امیر اللہ تسلیمؔ نے بار بار درخواست کی کہ وہ بیاض ان کو دیکھنے کی اجازت دے دی جائے، مگر ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اوّل لیاقت پیدا کر لو پھر یہ تمہارے لیے ہے۔(۳) کسی گلدستے میں غالبؔ نے ان کی ایک غزل پڑھ کر منشی نول کشور سے ان کے

---

(۱) اور (۲) لکھنؤ کا دبستان شاعری (بہ حوالہ حسرتؔ موہانی رسالہ اُردوئے معلیٰ سنہ ۱۹۰۸ء ص ۱۰۳)

(۳) لکھنؤ کا دبستان شاعری

حالات اور کلام منگوایا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ نسیم دہلوی ہیں تو لکھتے ہیں :۔

"کہربا جستم و عقیق یافتم"(۱)

نسیم مومن خاں کے ان شاگردوں میں ہیں جن سے ان کا سلسلہ شاعری آگے چلتا ہے وہ اگرچہ لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہاں کی محفلوں اور مشاعروں میں شریک ہوتے تھے مگر انھوں نے رنگِ دہلی کو ہمیشہ قائم رکھا۔ انشا و جرأت جیسی شخصیتیں لکھنؤ کی فضا میں پہنچ کر اپنا رنگِ شاعری تبدیل کر دیتی ہیں مگر نسیم کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ وہ لکھنؤ میں رہ کر دہلویت کی آن کو برقرار رکھتے ہیں اور اہلِ لکھنؤ جن سے ہمیشہ اہلِ دہلی سے معاصرانہ چشمک رہی ہے۔ نسیم کے لکھنؤ پہنچنے پر ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کرتے ہیں۔ ان کے تلامذہ کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ حسرت موہانی ان کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں :۔

" دل فریبیِ خیال اور رنگینیِ بیان شاعری کے دو خاص جوہر نسیم کو مومن خاں کے بہ حیثیت میراث استاد حاصل ہوئے تھے جن کو انھوں نے باضابطہ تجدید زبان خوب سے خوب تر بنا کر دنیائے شاعری میں اس آن بان کے ساتھ پیش کیا کہ لکھنؤی لفظ پرستوں نے بھی داد دی اور اظہار پسندی سے نہ رہ سکے۔ لکھنؤ کے بیان اور دہلی کی زبان کی پسندیدہ اور معتدل ترکیب کا جیسا جلوہ مرزا نسیم کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی۔"(۲)

غدر کے بعد منشی نول کشور مالک مطبع نے ان کو الف لیلیٰ نظم کرنے کی خدمت سپرد کی۔ نسیم ابھی اس کا ترجمہ کر رہے تھے کہ مالک مطبع کی طرف سے اس کو جلد مکمل کرنے پر اصرار ہوا۔ نسیم کو ناگوار گزرا اور اس خدمت سے سبکدوش ہو گئے اور بقیہ کتاب کو منشی طوطا رام نے پورا کیا۔ چنانچہ طوطا رام نے اس کی نشان دہی کر دی ہے۔

---

(۱) دلی کا دبستان شاعری ص ۲۶۳۔ مگر آج تک یہ سراغ نہ ملا کہ غالب کا کون سا خط تھا اور اب کہاں ہے۔

(۲) لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۴۶۵ (بحوالہ انتخاب اُردوئے معلیٰ) (سنہ ۸۔ ۱۹۰۶ء)

لکھا یاں تک نسیم دہلوی نے
لکھا ہے سے طوطا رام جی نے

نسیم کی طبیعت میں آشفتہ سری اور لاابالیانہ انداز بدرجہ اتم تھا۔ چنانچہ جو کچھ لکھا اس کی نقل کبھی پاس نہیں رکھی اور یہی سبب ہے کہ ان کا کافی کلام تلف ہوگیا۔ شاگردوں نے ان کا کلام جمع کرکے ان کو دکھایا تو کمزور شعروں پر خارج کرنے کے لیے نشان بنادیا۔ آخر میں جب دیکھا تو پورے دیوان پر کراس (×) بن چکا تھا۔ شاگردوں کو خیال آیا کہ اگر ان پر چھوڑ اگیا تو شاید کبھی شائع کرنے کی نوبت نہ آئے گی' اس لیے اس اس کو اسی طرح شائع کرادیا۔ چناں چہ مصطفائی پریس لکھنؤ نے ۱۲۸۵ھ میں شائع کیا۔ نسیم کا انتقال $\frac{\text{۱۸۶۵ء}}{\text{۱۲۸۲ھ}}$ میں ہوا۔

الف لیلیٰ کا جو منظوم ترجمہ کیا تھا اس کا نمونہ یہ ہے۔ تسلیم نے مادۂ تاریخ یہ برآمد کیا۔

مُنہ سے نکلی دمِ شیون تاریخ
ناظمِ ملکِ معانی ہے ہے
(۱۸۶۵ء ۱۲۸۲ھ)

سنبھل ساقی کہ اب اور آیا!
رہوں بے ہوش پھر وہ دور آیا
مزا رکھتا نہیں بے کیف جینا
تمنا ہے کہ برسے ابرِ مینا
ہر ایک قطرہ لہو بن بن کے ٹپکے
مرے دامن سے مَے چھَن چھَن کے ٹپکے
طبیعت صورت مے جوش میں ہے
تمنا عزم نوشا نوش میں ہے

نظر آئے کنارِ جام گلگوں
لبِ شاعر سے ٹپکے لطفِ مضموں
وفورِ شوق وقفِ گفتگو ہو
سخن افسانہ ریز آرزو ہو
گلے مِل مِل کے لفظوں سے معانی
دِکھائیں گفتگو کی نَو جوانی
طبیعت محو ہو عرضِ سخن میں
فسانہ یوں بیان ہو انجمن میں

غزلیات کا رنگ یہ ہے :-

بہت مشکل ہے رہنا پاک دامن لوث دنیا سے
اُلجھ کر رہ گیا جو وادیِ پُرخار میں آیا

کہے دیتی ہیں یہ نیچی نگاہیں
کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا

نام سُنتے ہی میرا شرما گئے
تم نے تو خود آپ کو رُسوا کیا

آنکھوں میں ہے لحاظ تبسم فزا ہیں لب
شکرِ خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ

شوقِ شراب و خواہشِ جام و سبو نہیں
ہے سب حرام جب مرے پہلو میں تو نہیں

افشائے محبت کا جو تھا خوف تو ہر اشک
آنکھوں میں نہاں تھا کوئی دامن میں چھپا تھا

گلے میں بخت کے ان کا بھی کچھ قصہ نکل آیا
ہوئی تھی صلح کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا (۱)

وحشت ـــــ غلام علی خاں

"خوش بیان دانائے حقیقت سید غلام علی خاں تخلص وحشت خلف میر فرحت اللہ خاں رئیس شاہجہاں آباد۔" (۲)

وحشت مراد آباد کے رہنے والے تھے مگر ان کی نشو و نما بنارس اور مرزا پور میں ہوئی۔ عربی فارسی کی تحصیل کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔ چنانچہ بلند شہر میں ایک ممتاز انگریزی عہدہ پر فائز ہوئے۔ گلشن بے خار میں شیفتہ لکھتے ہیں۔

"غلام علی خاں خلف الصدق میر فرحت اللہ خاں داماد مولوی رشید الدین خاں عقر اللہ لہما از دودمان کریم است از اکابر زادگان فخیم مولدش مراد آباد بنارس و شاہجہاں آباد نشو نما یافتہ۔ بالفعل بمناسب ممتاز انگریزی در بلند شہر بسر می برد۔" (۳)

حالی نے لکھا ہے کہ جب وحشت مومن کے مرنے کے بعد غالب سے ملنے جاتے تو غالب ان سے لپٹ کر کہتے کہ بھئی وحشت "زندگی سے وحشت ہو رہی ہے۔" اب وقت قریب ہے۔ (۴)

---

(۱) جلوۂ خضر ص ۲۶۵۔ گل رعنا ص ۳۸۹۔ آب حیات ۱۵۴۔ بیاض سخن ص سخن شعرا ص ۵۱۹۔ دلی کا دبستان شاعری ص ۲۶۲۔ بزم سخن ص ۱۱۲۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۲۶۔ خوش معرکہ زیبا (قلمی) طور کلیم ص ۱۱۶

(۲) خوش معرکہ زیبا ۱۱۲۔ (۳) گلشن بے خار ص ۲۳۴ (۴) یادگار غالب ص ۹۱

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید
مرگیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

ان کی شاعری کے متعلق گلشن بے خار کا یہ اقتباس کافی ہے :-

" ماه منیر اوج سخن سنجی و سخندانی است و مہر انور فلک مضامین و معانی گلہائے فکرش دستہ بزم گل رخاں را شاید و جواہر نظمش آویزۂ گوش یاقوت لباس را باید زہے صولت کلامش کہ از زبان حسود بے خواست بجائے طعنہ نعرہ احسنت خیزد۔ زہے ذوق گفتارش کہ در زہر خند شراب از دہان اعدا ریزد۔ عرصہ نظم پامال کردہ تر کتاز رخش اوست وقطع نظر ایں باوجود حداثت سن عنفوان شباب در اکثر کمالات جاہے بلند و مکانتے ارجمند دارد وہم بہ مقتضائے سن از رموز عشق ماہر وآشفتگی از اسمائش ظاہر دوست سراپا وفاق است و مخلص دور از نفاق سالہا است کہ من و او نرد محبت باختہ ایم۔" (۱)

ان کے کلام کا رنگ دیکھنا ہو تو یہ اشعار ملاحظہ کیجیے :-

آپ بتیں حرمت صہبا کی سُناتا ہوں اُسے
ذکر سُن سُن کے رقیبوں کی مے آشامی کا

سارے عالم سے صفائی ہوئی اپنی وحشت
کیا مکدر کہیں وہ آئینہ رُخسار ہوا

میرے مرنے کی خبر غیر کو یوں دیتے ہیں
مرگیا وحشتِ جاں باز تری جان سے دُور

---

(۱) گلشن بے خار ص ۲۳۴-۲۳۵

مجھ کو کثرت نے گُناہوں کی بچایا کہ وہاں
ایسے مجرم کی مقرر کوئی تعزیر نہیں

بے تکلف وہ آئے بہر تماشا وقت نزع
کام آسان ہوگیا یاں مردن دُشوار سے
کیوں نہ باطل سمجھوں اقرارِ وفا
سحر ٹپکے ہے تری گفتار سے
خط کے آنے سے گئی شرم سخن
آئینہ طوطی ہُوا زنگار سے

ایک رنج افزائے طبع نازک جاناں نہیں
آسماں پر ہے دماغ اس آہ بے تاثیر کا
اس نے دِکھلایا جو خطِ غیر مُنہ فق ہوگیا
ہاتھ آیا اپنے ایک نسخہ نیا اکسیر کا

ہے مُناہی کہ نہ کھینچے کوئی مجنوں کی شبیہ
اس قدر اب مری صورت سے وہ بیزار ہُوا

اے دل آساں نہیں جور اُٹھانے اس کے
نوجواں یار ہے وہ کچھ فلکِ پیر نہیں

ہے گرفتاری سے مری سارے عالم کی نجات
شور و نالہ سے مرے ہر شخص شب بیدار ہے (۱)

وزیر ـــــ وزیر علی خاں ـــــ ولادت ۱۸۴۲ء/۱۲۶۰ھ وفات ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ

قطب الدین باطن مصنف گلستان بے خزاں وزیر کا تعارف ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

" نواب وزیر علی خاں نام۔ جیری صاحب کے قائل اس لیے تحریر لاحاصل صولت شاہ سخن یہ ہے۔ دربار کاغذ میں حاضر ہر کہ و مہ ہے۔ حاکم طبع کا ایسا ماہر حکم ہے جس سے رعایائے مضمون صُمٌّ بُکمٌ ہے۔ (۱)"

وزیر علی خاں خلف کپتان حسن علی خاں ابتدائے عصر میں دہلی گئے۔ وہاں مومن کے شاگرد ہوئے۔ پھر واپس وطن (رام پور) آئے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ میں وفات پائی۔ انتقال کے وقت ۴۴ برس کی عمر تھی۔ (۳) دیوان ترتیب نہیں پایا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :۔

خاکِ درِ حضرت سے شفا ہوتی ہے اس کو
جس درد کی عیسیٰ سے دوا بن نہیں پڑتی (نعت)

شیشے میں نہیں شراب مدت گزری
مے خانہ ہوا خراب مدت گزری
توبہ کے عوض وزیر توڑا دل کو
ساقی کو دیا جواب مدت گزری (رباعی)

غزلیات کا انتخاب :۔

ارمان نکال لوں دلِ فرقت نصیب کا
دو دن کو دے خدا جو مقدر رقیب کا

حاشیہ صفحہ گزشتہ (۱) ـــــ

جلوہ خضر ص ۲۴۵۔ گلشن بے خار ص ۲۳۴۔ طبقات الشعرائے ہند ص ۴۰۵۔ سخن شعرا ۵۴۱۔ تذکرہ زیبا (قلمی) ص ۱۱۲۰۰۔ بہارِ بے خزاں (قلمی) ص ۱۶۶۔ گلستان بے خزاں ص ۲۷۹۔ بزم سخن ۱۱۸۔ گلستان سخن ص ۴۷۱۔ طورِ کلیم ص ۱۲۵ (۱) گلستان بے خزاں ص ۲۸۰ (۲) انتخاب یادگار ص ۳۹۳

لے گئے رُخ دکھا کے تاب و تواں
لُٹ گیا دن کو قافلہ دل کا

وہ آئیں نعش پہ ہم چُپ پڑے ہیں مُنہ ڈھانکے
اَجل نے ہم کو بہت ان سے شرمسار کیا

بیٹھ کر پاس مرے جب وہ اُٹھا شوخی سے
بے قراری سے کئی بار میں بیٹھا اُٹھا

انکار وصل سُنتے ہی اپنا ہوا وصال
بھیجا پیام یار نے پیک قضا کے ہاتھ

ہماری آنکھ نہیں روزِ وصل بھی کھُلتی
یہ دل میں ہیبت شبہائے تار باقی ہے"(۱)

یاسؔ ــــ حکیم خیرالدین

حکیم خیرالدین کا تخلص یاسؔ تھا۔ دہلی کے باشندے تھے۔ ان کا نام تو تقریباً ہر تذکرے میں ملتا ہے مگر تفصیلی ذکر کہیں نہیں ملتا :-

"خیرالدین ساکن دہلی۔ طبع شگفتہ دارد، اکنوں بفکر شعر کمی پرداز و خوشہ چینی خرمن فیضی خدمت مومنؔ خاں است۔ دریں ہنگام طبعش بکسب طب مصروف است گویا ہمیں سبب ترک سخن نمودہ "(۲)

---

(۱) یادگار انتخاب، ص ۳۹۳۔ گلستانِ بے خزاں، ص ۲۸۰
(۲) گلشن بے خار، ص ۲۴۲

طبقات الشعرائے ہند میں ان کے متعلق لکھا ہے :-

" یاس تخلص خیر الدین ساکن دہلی کا ہے۔ طبیعت شگفتہ رکھتا ہے، شاگرد مومن خاں صاحب کا ہے۔"

تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں سعادت علی خاں ناصر لکھتے ہیں :-

" خوش آئین صاحب قیاس خیر الدین تخلص یاس، شاگرد مومن خاں۔"

سخن شعرا میں ان کی شاگردی کے بارے میں لکھا ہے :-

" حکیم خیر الدین دہلوی شاگرد مومن خاں و ابراہیم ذوق۔"

کلام کا نمونہ یہ ہے۔ کسی تذکرے میں ان کے کسی مجموعہ اشعار کا ذکر نہیں ملتا۔

ہوں وہ ثابت رہِ اُلفت میں کہ جوں نقش قدم
جب تلک مٹ نہیں لیتا نہیں اصلا ہلتا

زانوئے یاس کہاں اور سرِ دلدار کہاں
ہم نشیں بات وہ کر جس کا ہو کچھ بھی سر و پا

شربتِ وصل نہ پینے دو، نہ سم کھانے دو
کیا قیامت ہے نہ جینے دو نہ مرجانے دو

عشوہ و ناز و ادا طعنہ سے کہتے ہیں مجھے
ایک دل رکھتے ہو کس کس کو دیا چاہتے ہو

رہتا ہے عاشقوں سے ازبس ہجوم در پر
ہو جائے گا گھر اس کا بازار رفتہ رفتہ

کے انتقال کے بعد غالب سے مشورہ سخن کرتے رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تلامذۂ مومن کی یہ تعداد کوئی بڑی تعداد نہیں لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ مومن جیسے رنگین مزاج اور کثیر الاشغال انسان کو استادی اور شاگردی کے جھنجھٹ میں پڑنے کے لیے وقت ہی کہاں ملتا تھا تو شاگردوں کی قلت پر مطلق تعجب نہیں ہوتا تھا۔ تعجب تو اس پر ہے کہ جملہ علوم، طب، ریاضی، نجوم، موسیقی اور شطرنج وغیرہ کے لیے جن میں ان کی حیثیت ایک ماہر خصوصی کی تھی اتنا وقت کہاں سے نکال لیتے تھے۔

اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ تلامذۂ مومن میری کتاب "مومن۔ شخصیت اور فن" کا ایک باب تھا۔ مگر مناسب خیال کیا کہ نظر ثانی اور جزوی اضافہ کے ساتھ اس کو ایک الگ کتاب کی صورت میں پیش کر دیا جائے۔

میں ڈاکٹر خلیق انجم (سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند) کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری لے لی۔

(پروفیسر) ظہیر احمد صدیقی

اس طرف کو دیکھنا بھی ہے تو شرمایا ہُوا
اَب تلک ہے آنکھ میں شب کا سماں چھایا ہُوا

ہے ستم میرا وہ بے تابی سے در پہ جانا
اور ترا ناز سے کہنا اسے مت آنے دو

لَب بند ہوں لذّت سے جو نام آئے زباں پر
لے کیا کوئی بوسے لبِ شیریں کے تمھارے

دَم تولے تیغ تلے اے تپشِ دل تھم جا
دیکھ قاتل کا مرے دھیان ہٹا جاتا ہے

مجھ کو تسبیح عقیق اپنی پنہا دی اس نے
دَب گیا ہاتھ تلے سینکڑوں من پتھر کے

کاش میں پردے کا شکوہ ہی نہ کرتا ان سے
بے حجابی نے کیا اور بھی بے تاب مجھے

اس کے جُوڑے کے تصوّر میں کہوں کیا اشعار
دل میں مضموں کی جگہ دھیان بٹا جاتا ہے (۱)

---

(۱) طبقات الشعرا، ص ۳۹۵، گلشن بے خار ص ۲۴۲، سخن شعرا، ص ۵۶۷

اشاریہ

(ا)

	صفحہ
آزردہ (صدرالدین)	۶۰۶ - ۷۹
آشفتہ (منوّر علی)	۳۶
آقا علی خاں	۱۱۶
آہی (عبدالرحمٰن)	۴۴ - ۴۲
ابن جوزی	۷۸
ابن رشیق	۱۷
ابن الرومی	
ابوسعید (شاہ)	۷۸
احمد سعید (شاہ)	۷۸
احمد علی خاں (نواب)	۹۲ - ۵۲
احمد بخش	۵۷
احمد بیگ	۵۹
احتشام حسین	۱۹
احسان (عبدالرحمٰن)	۵۶
اسمٰعیل بیگ	۷۷
اسحاق (شاہ)	۷۸
اسحاق (نواب)	۷۹
اسیر (مظفر علی)	۱۱۲ - ۱۱۱

	صفحہ
اصغر علی خاں	۴۷ - ۳۹
اقبال	۱۹
اکبر علی خاں	۴۲ - ۴۱
اکبر (بادشاہ)	
اکبر شاہ (ثانی)	۷۰
اکبر محمد	۷۰
اکبری بیگم	۷۷
الف ثانی (مجدد)	۵۷
امام الدین ناصری	۱۰۷
امتیاز احمد	۱۰۴
امراؤ القیس	۱۸
امیر مینائی	۴۰ - ۴۷ - ۵۸ (حاشیہ) ۹۰ - ۹۳ - ۱۰۸ - ۱۱۲ - ۱۱۳ - ۱۱۴
انتظام علی	۹۹
انشا	۱۱۸

(ب)

باطن (قطب الدین)	۱۲۴ - ۴۶
باقی باللہ	۹۰ - ۴۰
برق	۶۹ - ۶۸ - ۶۷

(ب) صفحہ

بنتے سنگھ ۷۱

بے تاب ۲۱-۴۹-۵۰-۹۲

بے خبر ۱۱۲

(پ)

پنجہ کش ۱۰۷

(ت)

تسکین (میر حسین) ۴۳-۴۴-۴۶-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۸۹-۹۲

تسکین (مظفر بیگ) ۵۵

تسلیم (امیر اللہ) ۲۶-۲۷-۱۱۷-۱۱۹

تلسی داس ۱۸

تہوّر ۵۶

تیمور ۷۲

(ث)

ثروت (محمد بخش) ۵۷

ج

جذب ۸۸

جرأت ۱۱۸

چ

چند ولال ۷۰

چیری ۱۲۴

ح

حسن (میر صاحب) ۵۱

(ح) صفحہ

حسن علی خاں ۱۲۴

حسرت موہانی ۱۱۸

حیا ۱۶-۲۶

حیدر (میر) ۵۱

(خ)

خورشید احمد ۱۰-۵۷-۵۸

خورشید (خوش وقت علی) ۶۸

(د)

درد ۳۲-۱۰۷

ذکی (مہدی علی) ۹۳

(ذ)

ذوق ۳۲-۷۹-۱۰۲-۱۲۶-۱۳-۱۴-۱۵-۲۱

(ر)

راحت (محمود بیگ) ۵۹-۶۰

راسخ ۶۳

رافت ۵۸

رشکی ۷۹

رشید الدین

رمجو ۷۷-۷۸

رومی

(س)

سالک ۲۱-۵۲-۶۴-۶۶

(س) صفحہ

سحر (احمد حسین) ۷۹
سراج (منہاج) ۶۷
سراج (حنفی) ۷۷
سروش ۲۷-۴۸-۶۷
سری رام ۶۵
سعادت علی خاں ۱۰۸
سعید خاں (نواب) ۴۷-۹۰
سکندر علی خاں ۷۹
سمبھو ۷۰

(ش)

شاہ عالم ثانی ۱۰۲
شبلی ۶-۱۸
شکور احمد (شاہ) ۵۷
شوقین (غلام احمد) ۷۰
شہرت ۷۲-۷۵
شیدا ۷۵
شیفتہ ۱۰-۱۴-۲۱-۲۴-۳۷-۴۱-۴۹-۵۲-۷۱-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳

(ص)

صابر (قادر بخش) ۶۹-۱۰۲
صاحب (امۃ الفاطمہ) ۸۳-۸۴
صائب
صبر ۸۹

(ص) صفحہ

صدیق حسن (نواب)
صغیر ۸۶
صہبائی ۵۱-۷۹-۸۰-۸۹-۹۹

(ض)

ضیاء احمد (پروفیسر)

(ط)

طوطا رام ۱۱۸

ظ

ظریف ۳۹
ظفر (بہادر شاہ)
ظہور ۸۶

(ع)

عاشور علی ۶۴
عالم بیگ ۶۴
عبدالعزیز (شاہ) ۷۸
عبدالقادر (شاہ)
عبداللہ (شیخ) ۷۷
عبدالماجد ۹۶
عبدالرحمٰن ۴۸-۶۷
عبدالعلی (نواب) ۷۷-۹۳
عرشی ۱۱۱-۱۱۳
عظمت ۸۹
علاء الدین ۸۵

(ع) صفحہ

علی نواز ۳۷
عماد الملک (نواب) ۶۵
عنایت ۴۸-۸۹-۹۲
عندلیب شادانی ۸۷

(غ)

غالب ۵-۱۰-۱۴-۱۵-۲۱-۲۶-۳۲-۶۵-۶۶-۶۷-۷۹-۸۰-۸۴-۹۳-۱۱۴-۱۱۷-۱۲۱
غربت ۴۸-۹۳
غریب ۹۵
غلام محمد ۹۳-۶۷
غمگین ۴۳-۹۲
غنی ۷۸-۹۵-۹۶
غیاث الدین ۱۱۱

(ف)

فائق ۵۸
فتح علی ۹۳
فرحت (حسین علی) ۷۲
فرحت اللہ ۱۴-۱۵-۱۲۱
فرخ سیر ۱-۵۱
فردوسی ۱۸
فضل حق ۱۱۱
فیاض علی ۱۰۷
فیض اللہ (نواب) ۹۳

(ق) صفحہ

قادر بخش ۸۷
قدر بلگرامی ۶۵
قلق ۹۸-۹۹-۱۰۰
قمر طالع ۷۲
قیصر ۱۰۲

(ک)

کاظم ۱۰۳
کرم ۱۰۳-۱۰۴
کریم الدین ۸۹
کلیم الدین

(گ)

گارساں دتاسی ۶۹

(م)

مالک رام ۵۸-۶۸
منشی
محمد نور ۷۷
محمد عابد ۷۷
محمدی ۹۶
مرتضیٰ خاں (نواب) ۷۷
مرزا جہاں ۶۹
مسکین ۱۰۵-۱۰۶
مشتاق ۹۹

(م) صفحہ

مضطر ۱۰۷
مائل ۱۰۷
موجد ۱۰۸
مہاراج (حاشیہ) ۵۰
میر ۱۸

(ن)

نادم (بیتاپوری) ۹۶
ناصر (سعادت علی) ۱۰۶ - ۱۲۶
ناصر احمد ۱۰۷
ناسخ ۱۴-۱۵-۲۶-۳۲
ناظم ۱۰-۲۱-۱۱۰-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-۱۲۴
نذیر حسین (محدث) ۱۰۷
نساخ ۵۸-۶۹-۷۹-۱۰۶
نسیم (اصغر علی) ۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸-۱۱۹
نشاط ۸۵
نصیر (شاہ) ۱۵-۳۲-۵۱-۵۲-۸۵

(ن) صفحہ

نقشبند ۷۹
نقشبند خاں (حکیم) ۹۹
نول کشور ۱۱۷-۱۱۸
نیر ۷۹
نہفی ۷۸

(و)

وحشت ۸-۱۲۱-۱۲۲
ورجل ۱۸
وزیر علی ۱۴-۱۲۴
ولی داد ۷۷

(ہ)

ہلکر ۷۷
ہومر ۱۸

(ی)

یاس ۱۲۵-۱۲۶

اردو میں اُستادی شاگردی کی روایت

کسی مفکّر کا قول ہے کہ شاعر کو خیالات آسمان سے ملتے ہیں اور زبان زمین سے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاعر کا ذہن جن خیالات کو دل و دماغ کا حصّہ بناتا ہے ان کا وہ اظہار بھی کرنا چاہتا ہے۔ اظہار کے لیے اس کو پیرائیہ بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پیرائیہ بیان میں الفاظ کا انتخاب، تراکیب اور محاورے، صنائع و بدائع کا استعمال۔ یہ تمام باتیں شاعر کے لیے اس لیے مسئلہ بن جاتی ہیں کہ وہ یہ طے نہیں کر پاتا کہ پیرائیہ بیان کے اس سیلاب میں کس کا انتخاب کرے۔ اور کس کو ترک کرے۔ یہ اخذ و ترک کا مسئلہ استاد کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔ جلیل قدوائی نے 'مشاطۂ سخن' کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"اردو شاعری میں زبان، محاورہ، فصاحت، بلاغت، روزمرہ پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ جب تک ان دشواریوں سے گذر کر شاعر اپنے میں ایک خاص مشق و ہنر نہ پیدا کرے وہ شاعر نہیں ہو سکتا۔[1]

اس بات کو دوسرے انداز میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو چیز خیال میں حسن و رعنائی اور شعر کے مفہوم میں وسعت پیدا کر دیتی ہے وہ دراصل استاد کا ادبی تجربہ ہے جس کو وہ شاگرد کے کلام پر آزماتا ہے اور اس کو بہتر صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ عبدالحق نے بھی اس بات کی تائید ان الفاظ میں کی ہے۔

"ہمارے یہاں استادی شاگردی کا عجیب تعلق چلا آرہا ہے مگر اب اس کی وہ شان

---

[1] دیباچہ مشاطۂ سخن جلیل قدوائی

اور اس کے وہ آداب باقی نہیں رہے۔ اس وقت مشق سخن اور شاعری کی تربیت کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ باکمال استاد اپنے شاگرد کو بتاتا اور شعر و شاعری کے گُروں سے واقف کراتا اور خاص کر الفاظ کے صحیح استعمال زبان کی فصاحت، بول چال کی صفائی، اسلوب بیان اور مضمون کے ادا کرنے کے ڈھنگ سمجھاتا جاتا۔ ہمارے ہاں سب سے بڑا مدرسہ یہی تھا۔[1]"

غالباً یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ شاعری میں استادی شاگردی کا رشتہ کس نوعیت کا ہوتا ہے اور اس کا بنیادی مقصد کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ استاد اپنے شاگرد کو مثل اولاد کے خیال کرتا ہے اور شاگرد بھی اس طرح استاد کی خدمت کرتا ہے جیسے کوئی سعادت مند اولاد باپ کی خدمت کرتی ہے۔ استاد ان شاگردوں کی اس طرح تربیت کرتا کہ کل جب وہ خود استاد ہوں تو کوئی حرف گیر نہ ہو۔ یہ ذہنی ادارہ ظاہری رسم و رواج اور پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس شاعر کو حقیر خیال کیا جاتا جو 'بے استاد' ہوتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ غالب کو بھی ایک فرضی استاد 'عبدالصمد' کو ایجاد کرنا پڑا۔ استاد کا تجربہ اور مطالعہ شاگرد کی رہنمائی کرتا ہے۔ سیماب اکبرآبادی نے اپنی زندگی کا یہ واقعہ تحریر کیا ہے کہ میری دوسری یا تیسری غزل پر داغ نے لکھ دیا کہ "ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے"۔ اس ہدایت کے بعد کافی عرصہ تک کوئی غزل اصلاح کے لیے نہیں بھیجی اور مشق سخن کرتے رہے۔ آخر ایک مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے غزل لکھی اور استاد کے پاس روانہ کی۔ جب غزل واپس آئی تو اس کاغذ کے شروع میں لکھا تھا "آفریں ہے۔ کیا خوب غزل کہی ہے"۔[2]

ہر استاد کی اصلاح کا رنگ ڈھنگ الگ ہوتا ہے۔ بعض اساتذہ لفظ کو بدل کر شعر کا معیار اونچا کر دیتے ہیں۔ لفظ یا ترکیب کے بدلنے کی عام طور سے وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ شعر زیادہ فصیح ہو جائے یا معنویت کے اعتبار سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے۔ کبھی پورے شعر کو بدل کر نیا شعر

---

[1] نوٹ مشاطۂ سخن — عبدالحق

[2] کلیم عجم۔ سحر الحیات۔ — سیماب اکبرآبادی

شامل کر دیا جائے جو عطیہ استاد ہوتا ہے۔ احسن مارہروی ایک خط میں شوق کو لکھتے ہیں۔

"غزل بعد اصلاح واپس ہے۔ ضوابط و قواعد کوئی خاص نہیں بجز اس کے کہ جو بات بتائی جائے اس کی پابندی کی جائے اور اساتذہ کے کلام پر نظر رہے تاکہ بندش اور انداز بیان میں فصاحت و روانی آئے۔"[1]

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض اساتذہ کے نقطۂ نظر کے اقتباسات پیش کر دیئے جائیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کا نقطۂ نظر کیا تھا۔ تنقید شعر میں ان کی کیا ضرورت اور اہمیت ہے۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ تغزل میں ہمیشہ جذبات انسانی کا خیال رکھا کیجئے .... لکھنؤ کی ان ترکیبوں سے جو آج کل وہاں کی غزل سرائی کو 'نیک نام' کیے ہوئے ہے کوسوں بھاگئے۔"[2]

ایک جگہ صفدر مرزا پوری تحریر کرتے ہیں۔

"اصلاح کا مقصود محض عیوب و نقائص کو رفع کرنا۔ کمی کو پورا کرنا یا ماند رنگ کو اجالنا ہے۔ نقائص و عیوب۔ تخیل و مطالعہ فطرت کے متعلق ہوں یا زبان کے یقیناً قابل اصلاح ہیں مگر نفس مضمون کو از سر تا پا بدل دینا یا اپنی طرف سے ایک نیا تخیل پیش کر دینا اصلاح کا منشا نہیں ہے۔"[3]

ان دونوں اقتباسات سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ تغزل میں جذبات انسانی کا خیال رکھنا چاہیئے۔

۲۔ مصنوعی ترکیبوں سے پرہیز ضروری ہے جس کو شوق نے لکھنؤ کی روایت سے وابستہ خیال کیا ہے۔

۳۔ اصلاح کا مقصد عیوب شعری کو رفع کرنا ہے۔

---

[1] ضمیمہ اصلاح سخن — خط احسن مارہروی

[2] ضمیمہ اصلاح سخن — خط احمد علی شوق

[3] تمہید مشاطۂ سخن — صفدر مرزا پوری

۴۔ نفس مضمون کو اصلاح میں بدلنا غلط ہے۔

۵۔ بندش اور انداز بیان میں روانی ہونا چاہیئے۔

تنقید شعر ہمارا ادبی سرمایہ ہے جس میں خیال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر تمام زور اس بات پر ہے کہ شعر کی خوبی جذبات کا اظہار اور فصاحت ہے۔ علامہ شبلی نے شعر العجم میں اس بحث کو اُٹھایا ہے اور ان کا خیال ہے " شاعری کا معیار کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے[1] مگر زمانہ نے کروٹ بدلی ترقی پسند تحریک سے وابستہ حضرات نے دوٹوک اعلان کر دیا۔ " وہ لوگ جو فنون لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ہیئت اور اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے[2]" یہ دونوں نظریات اپنے عہد اور مسلک کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ آتش نے بھی شاعری کو 'مرصع سازی' سے تعبیر کیا تھا اور وہ ایک مصنوعی زبان کی حمایت کر رہے تھے جس کی جگمگاہٹ کچھ عرصہ تک تو قایم رہی مگر جلد ہی اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ ان دونوں نقطۂ نظر نے ہم آہنگی پیدا کرنے کا خیال اس دور کے ان اہل علم کو آیا جنھوں نے کسی سیاسی، سماجی مسلک کی زنجیروں میں اپنے آپ کو مقید نہیں کیا تھا۔ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے نظام کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے اور کھلے ذہن سے ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان میں ایک نام سیماب اکبر آبادی کا بھی ہے۔ انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں واضح طور پر لکھ دیا۔

" اگر ہم من حیث الشاعر دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اگر ہمیں اپنی شاعری کو ایک زندہ قوم کی شاعری بنانا منظور ہے تو ہمیں اپنی موجودہ ذہنیت، موجودہ تخیل اور موجودہ قواعد و ضوابط میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہے[3]"

اور یہ انقلاب اس وقت ممکن ہے جب ہیئت اور مواد میں توازن پیدا ہو گا۔ قدیم اصطلاحات اور علامتوں کو نئے مسائل سے ہم آہنگ کرنا ہو گا۔ سیماب کا یہ پیغام وہی ہے

---

[1] شعر العجم

[2] احتشام حسین [3] کلیم عجم خطبہ چوتھا۔ سیماب اکبر آبادی

جو مقدمۂ شعر و شاعری میں حالی دے چکے ہیں۔

"دنیا میں ایک انقلابِ عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا ہے آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تنا اور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو ان کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں ..... یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے رہ جائے گی بلکہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے۔[1]"

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اس نزاکت کی طرف اشارہ کر دیا جائے جو استاد اور شاگرد دونوں کو پیش آسکتی ہے۔ ایک صورت حال یہ بھی ہے کہ استاد محض راستہ دکھا دیتا ہے اور شاگرد سے توقع کرتا ہے کہ اس کی روشنی میں غزل کو نئے سانچے میں ڈھال لے۔ ذیل کی دو مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ استاد کی اصلاح شعر کو کس درجہ پر پہنچا دیتی ہے۔ ایک مثال عبدالعلی شوق کی تالیف "اصلاح سخن" اور دوسری صفدر مرزا پوری کی تالیف "مشاطۂ سخن" سے پیش کی جارہی ہے۔ شوق کا شعر ہے جس پر مختلف اساتذہ نے اصلاح دی ہے۔

شوق :	کہتی ہے یہ راز ان کی آنکھوں کی پریشانی	بیمار کی حالت کچھ تغیر نظر آئی
آرزو :	کہتا ہے یہ راز ان کی آنکھوں کا بدل جانا	بیمار کی حالت کچھ تغیر نظر آئی
بیخود موہانی :	کہتے ہیں یہ ہر اک سے قاتل کے بچھے تیور	مجروح کی حالت کچھ تغیر نظر آئی
فانی :	کچھ راز ندامت اب ان آنکھوں سے کھلتا ہے	بیمار کی حالت کیا تغیر نظر آئی
نیاز :	یہ شعر نکال ڈالیے۔ حالت تغیر نہیں ہوتی بلکہ حالت میں تغیر ہوتا ہے۔	

بیخود دہلوی۔ صفی اور وحشت نے اس شعر کو بدستور رکھا ہے۔

اصلاح سخن میں ناظم علی خاں ہجر کا ایک شعر تھا جس پر داغ نے اصلاح دی تھی۔ ہجر کا

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری۔ حالی

دبستانِ مومنؔ

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

کا شعر تھا۔

اے حسن یار تیری ذرا بھی خطا نہیں　　میں حسن اتفاق سے دیوانہ ہو گیا

داغ کی اصلاح: ہاں ہاں تمہارے حسن کی کوئی خطا نہیں　　میں حسن اتفاق سے دیوانہ ہو گیا

"ہاں ہاں، کے ٹکڑے نے اس شعر کو کیا سے کیا کر دیا۔ معنی کا لطف، مصرعہ کی برجستگی، بندش کی چستی، معشوق کا جواب الجواب۔"

ان اصلاح سے ایک طرف شعر کی جو صوری اور معنوی وسعت پیدا ہوئی ہے وہ اہل فن سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔ دوسری طرف اساتذہ کی اصلاح سے ان کے افتاد طبع اور مزاج شعری کا بھی پتہ لگ سکتا ہے۔ عبدالحلیم شرر کا خیال درست ہے کہ "ہر شاعر اور ہر استاد کی زبان اور مذاق سخن میں کس قدر اختلاف ہوا کرتا ہے۔ جو چیز ایک کی نظر میں عیب ہوتی ہے وہی دوسرے کی نظر میں خوبی ہے۔"[1] اصلاح سخن، کے تبصرہ میں عبدالستار صدیقی نے اصلاح شعر کے سلسلہ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اصلاح کا سب سے غلط طریقہ یہ ہے کہ شاگرد کے کسی شعر میں سقم دیکھ کر استاد نے شعر کاٹ دیا اور دوسرا شعر عطا کر دیا۔ اور اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ اس شعر نے پورا مشاعرہ لوٹ لیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ شاگرد کو کیا فائدہ ہوا اور اس کی معلومات میں کیا اضافہ ہوا۔ سیماب اپنے تلامذہ کے علاوہ دوسرے مبتدی شعرا کو بھی یہ ہدایت کرتے ہیں۔

"آگے بڑھنے کا ذریعہ کثرت مطالعہ اور کثرت مشق ہے۔ اساتذہ کی اصلاح بھی اس منزل میں رہنمائی کر سکتی ہے لیکن میں نے بعض طلبہ کو دیکھا ہے کہ وہ اصلاح پر زیادہ غور نہیں کرتے ہیں اور اکثر اصلاح دینے والوں کے بھروسے پر محنت اور فکر سے شعر بھی نہیں کہتے۔ یہ خوئے اعتبار غلط ہے۔ شعر ایسا کہنا چاہئیے جس میں اصلاح بہت کم ہو وہ اساتذہ جو کشادہ دلی اور غایت التفات سے اپنے شاگردوں کی غزلیں بناتے نہیں بلکہ تصنیف کرتے ہیں، حقیقت میں کچھ اچھا نہیں کرتے۔ اس طرح ان میں غور و فکر کی قوت پیدا نہیں ہوتی اور وہ عمر بھر محتاج اصلاح رہتے ہیں۔"[2]

---

[1] کلیم عجم۔ سحر الحیات۔ سیماب

کبھی اصلاح سے صورت حال یہ بھی پیدا ہوجاتی ہے کہ ہر استاد کا ایک مخصوص لب ولہجہ اور تراکیب شعوری یا غیر شعوری طور پر اصلاح کے وقت ترکیب شعر میں شامل ہوجاتے ہیں۔ اگر شاعر کا پتہ نہ چلے تو خدشہ رہتا ہے کہ شاگرد کی تخلیق استاد کے حصّہ میں پہونچ گئی۔ شاگردان مومن کے یہ اشعار پڑھئے اور مومن کے لب ولہجہ سے ان کا موازنہ کیجئے۔

تسکین: ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے — کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی !

سالک: سالک صنم کدہ سے نکالے گئے کہیں — حضرت ارادہ رکھتے ہیں کیوں خانقاہ کا

قلق: خلش جائے تو کیا جائے کہ یہ خلجان باقی ہے — بچا یا آبلہ پائی سے میرے خارما ہی کو

استادی اور شاگردی کی روایت کب سے شروع ہوئی اس بارے میں کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جاسکتی۔ شاعر تلمیذ رحمانی ہوتا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غیب سے آنے والے مضامین بے ترتیب تھے۔ شاعر نے ان میں ترکیب پیدا کی اور موزونیت بخشی، استاد نے اس کے لوک پلک درست کرکے آراستہ کیا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ 'غیب کے مضامین' نے جب ارضیت حاصل کی تو چراغ سے چراغ جلنا شروع ہوگئے۔ ایک خیال کے بطن سے دوسرا خیال پیدا ہونے لگا۔ اگر یہاں پر استاد کی رہ نمائی نہ ہوتو میر کے اس فقرے کو یاد رکھئے جو انھوں نے مرزا غالب کے اشعار سننے کے بعد کہے تھے کہ اس لڑکے کو کوئی استاد نہ ملا تو بہک جائے گا۔ مشرقی آداب میں یہ ضروری تھا کہ جس استاد کا دامن تھام لیا پھر دوسرے کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ استاد کے انتقال کے بعد ہی کسی دوسرے استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ تاریخ ادب میں ایسی متعدد مثالیں مل جائیں گی۔ شیفتہ ناظم، خورشید، سالک یہ لوگ مومن کے انتقال کے بعد غالب کے شاگردوں کے دائرہ میں داخل ہوئے۔

جیسا کہ عرض کیا کہ اس کا تعین کرنا تو دشوار ہے کہ استادی شاگردی کا سلسلہ کب سے شروع ہوا اور وہ کیا اسباب تھے جس نے اس ادارہ کو جنم دیا۔ البتہ یہ ضرور قیاس کیا جاسکتا

ہے کہ جب سے اردو شاعری کا وجود عمل میں آیا اور شعری نشستوں نے مشاعروں کا رنگ اختیار کیا تو شاعر کو فن شعر کے سلسلہ میں مشورہ لینے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی ہوگی۔ اپنے برابر والوں سے مشورہ اور اپنے سے بڑے شاعر سے اصلاح کا خواہش مند ہوا ہوگا۔ مشاعروں میں کلام پڑھنے کے لیے 'عزت سادات' کا بھی سوال پیدا ہوتا ہے اس لیے شاعر کی کوشش رہی ہوگی کہ اس کے کلام میں کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے کہ دوسرے اس پر معترض ہوں۔ اس احساس اور جذبہ نے شعرا کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ اور جب یہ لے بڑھی تو مشاعروں میں ادبی معرکے ہونے لگے۔ اور اگر یہ مفروضہ درست ہے تو استادی شاگردی کی روایت کو شمالی ہندوستان میں اٹھارویں صدی سے جوڑنا ہوگا۔ آیئے دیکھیں کہ دوسری زبانوں میں اصلاح یا استادی شاگردی کے سلسلہ میں کیا رویہ رہا ہے۔

عربی شاعری میں اصلاح شعری کی کہانی طویل ہے۔ جاہلی عہد کے شعرا جن کا نام بقائے دوام حاصل کر چکا ہے ان کے اشعار پر کوئی مشورہ یا شعر پر اصلاح کر دیتا تو شاعر آمادۂ جنگ ہو جاتا تھا۔ اسلام کے اوّلین دور میں خود رسول اللہ کی وہ اصلاح مشہور ہے جو انھوں نے قصیدہ بانت سعاد پر دی تھی مصرعہ رسول اللہ کی مدح میں تھا۔

مہند من سیوف الہند مسلول

(ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار جو میان سے کھینچ لی گئی ہو) حضورؐ نے 'الہند' کی بجائے 'اللہ' کر دیا۔ اس میں 'اللہ' کے لفظ سے اسلامیت کا تصور واضح ہو گیا۔ پھر 'مہند' میں خود 'ہند' کا تصور موجود ہے۔ اس لیے اس کو بدل دیا۔ بنو امیہ کے زمانے میں شعرا میں اس لیے شاعرانہ نوک جھونک رہتی تھی کہ ایک کو قرب سلطانی حاصل ہوتا اور دوسرا اس اعزاز سے محروم ہوتا۔ محروم سلطان کی نظر میں اپنا اعتماد قایم کرنے کے لیے کوشش کرتا کہ فریق مخالف کی شاعرانہ کمزوریوں کو رمز و کنائے کے پردے میں بیان کر دے۔ شعری معرکہ آرائی کے لیے جریر اور اخطل کے نام مشہور ہیں ان دونوں شاعروں نے ایک دوسرے پر سخت اعتراض کیے اور ان کے ہمدردوں نے ایک دوسرے پر اعتراضات کی بھرمار کر دی۔ جہاں اعتراض میں وزن ہوتا وہاں قاری کو ان کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ ہو جاتا۔ عباسی دور میں ملک الشعرا

کا منصب عرصہ تک رہا۔ اور اس کے پیچھے ایران کی روایت تھی۔ جہاں بادشاہ کے دربار کا ایک رکن مذہبی تعلیم اور قواعد کا ماہر ہوتا تھا۔ لیکن پہلوی تذکروں میں بادشاہ کا مقرب جو کچھ کہتا تھا اس کی ہمیں تفصیل نہیں ملتی۔ لیکن جدید فارسی کی نشو و نما کے ساتھ یہ قدیم ایرانی دستور پھر ایران میں واپس آگیا۔ قدیم بادشاہوں کی طرح سے سیاسی اقتدار رکھنے والے حکمراں کم تھے یا جنھوں نے کشور کشائی کا دائرہ بڑھایا۔ مثلاً سلجوقی اور تیموریہ خالص ایرانی روایت کے مستند مبلغ نہ تھے۔ چنانچہ ایران میں ایک ہی وقت میں بڑے شعرا کی موجودگی کی وجہ سے ماحول کچھ اس انداز کا رہا جیسے بنو امیہ کے عہد میں عربوں کا تھا۔ کسی شاعر پر اعتراض کی صورت میں وہ اشعار ہیں جو خاقانی کے استاد نے لکھ کر دیئے تھے "شعر مرا بہ مدرسہ کے برد"۔ یا عقیدت مند لوگ جو شاعر سے سوال کرتے تھے تو اپنے اعتراض کا سبب بھی بیان کرتے۔ عام طور سے عقیدت مند یا شاگرد استاد کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتے اور استاد کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ استاد ان پر اصلاح کر دیتا اور اصلاح کا سبب بھی بیان کر دیتا۔

شمالی ہند میں اصلاح کے لیے مخصوص اسباب تھے۔ مسلمانوں کے طبقوں میں اس وقت بھی جب فارسی رائج تھی۔ فارسی اور عربی کا لغوی علم اور قواعد سے واقفیت ہر شخص کی دسترس میں نہیں تھی۔ لیکن اصلاح اسی کی قبول کی جاتی تھی جس کو مستند خیال کیا جاتا تھا۔ کسی نے شعر پڑھا۔

سیہ چوڑی بہ دست آں نگار نازنیں دیدم
بہ شاخ صندلیں پیچیدہ مار آستیں دیدم

(میں نے اس نازنیں محبوبہ کے ہاتھ میں سیہ چوڑی دیکھی۔ گویا شاخ صندلیں پر بل کھایا ہوا آستین کا سانپ دیکھا)

شیخ علی حزیں نے اعتراض کیا اور فوراً اصلاح دی۔

سیاہ چوڑی بہ دست آں نگارے
بہ شاخ صندلیں پیچیدہ مارے

دکن میں بھی اس کے کچھ نقوش مل جاتے ہیں۔ مثلاً نصیر الدین ہاشمی "دکن

میں اردو" لکھتے ہیں۔

"عبدل، ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں تھا اور اپنے آپ کو سلطان کا شاگرد کہتا تھا۔ اس زمانے میں عام طور سے یہ دستور تھا کہ شاہی استاد خود کو شاگرد کے لقب سے موسوم کرتے تھے[1]"

مگر بعد کو جب دکن کا رشتہ شمالی ہند سے استوار ہوا تو مشاعروں اور استادی شاگردی کی روایت کو بھی فروغ ہوا۔

شمالی ہند میں اس روایت نے مشاعروں کو جنم دیا اور مشاعرے محض شعرا کے کلام سن کر واہ واکہنے کی جگہ نہیں تھی بلکہ یہ ایک تربیت گاہ بھی تھی۔ اساتذہ اپنے شاگردوں کو لے کر مشاعرے میں جاتے تھے۔ اگر کسی شاعر کے کسی شعر میں کوئی سقم دیکھا تو چشم ابرو سے ورنہ بآواز بلند شاعر کی توجہ اس خامی کی طرف مبذول کرا دیتے۔ آب حیات میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ آزاد نے ذوق کا ایک مطلع اوج کے سامنے پڑھا۔

مقابل اس رخ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

جب کئی دن بعد اوج دوبارہ ملے تو انھوں نے ایک شعر پڑھا۔

یاں جو برگ خورشید کا کھڑکا ہو جائے
دھول دستار پر لگے فلک تڑکا ہو جائے

آزاد کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ طنز کرتے ہیں مجھ پر کہ محاورہ 'تڑکا ہونا' ہے۔ 'سحر ہونا' نہیں ہے۔ دوسرے دن جب آزاد نے یہ واقعہ ذوق کو سنایا تو وہ کہنے لگے۔

شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اس گستاخی کی سزا میں صبا ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ وہی اس کے حق میں سحر ہو جائے۔ یعنی روشنی نصیب نہ ہو ..... وہ اور بات ہے۔

---

[1] دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی

اب یہ ایک حسن اتفاق ہے ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ موجود ہے[1]۔"

ایک واقعہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے "دہلی کے ایک آخری یادگار مشاعرہ" میں بیان کیا ہے رحیم الدین حیاؔ نے جب یہ شعر پڑھا۔

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے

دم نکلتا نہیں مصیبت ہے !

تو ان کے والد نے ٹوکا اور کہا "میاں حیاؔ! لکھنؤ جاکر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب زبان بھی بدل دی۔ سانس کو مونث باندھ گئے۔" حیاؔ نے جواب دیا "قبلہ! میں نے استاد ذوقؔ کی تقلید کی ہے۔ ان کا مصرعہ ہے ع سینے میں سانس ہوگی اڑی دو گھڑی کے بعد" صاحب عالم نے جواب دیا" بھلا ہمارے مقابلہ میں آپ کے استاد کا کلام سند ہو سکتا ہے؟ وہ جو چاہیں لکھیں۔ یہ بتاؤ قلعہ میں سانس مذکر ہے یا مونث[2]؟"

اساتذہ اچھے شاگردوں کے کلام پر محنت کرتے اور اس طرح ان کی ادبی تربیت ہوتی تھی۔ زیادہ کشادہ دل استاد شاگرد کی اصلاح بھی قبول کر لیتے تھے۔ غالبؔ کا شیفتہ کے بارے میں اعتراف ہے۔

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او

ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

آب حیات میں ناسخ کے باب میں یہ واقعہ درج ہے کہ ایک سوداگر بچہ جو دولت حسن سے مایہ دار تھا لیٹا ہوا تھا۔ آنکھوں کا یہ حال تھا کہ کچھ جاگتا ہے اور کچھ سوتا ہے۔ ناسخ نے مصرعہ پڑھا۔ ع ہے چشم نیم باز، عجب خواب ناز ہے "، ابھی دوسرا مصرعہ سوچ رہے تھے کہ خواجہ وزیر آ گئے انھوں نے خاموشی کا سبب دریافت کیا تو شیخ نے سبب بتایا۔ وزیر نے فوراً دوسرا مصرعہ ادا کیا۔ ع فتنہ تو سو رہا ہے، در فتنہ باز ہے"۔ شیخ بہت خوش

---

[1] آب حیات

[2] دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ

ہوئے اور برجستگی کی داد دی[1]۔

ان روایتوں کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مشاعرے جب تک تجارتی مرکز نہیں بنے تھے اس وقت ان کی حیثیت ایک تربیت گاہ کی تھی۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ مقدس تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم زمانے میں بعض استاد اپنے شاگردوں کی ٹولی لے کر پہونچ جاتے تھے۔ جس کی شکایت مومن خاں کی زبان سے مرزا فرحت اللہ بیگ کرتے ہیں۔

"بس صاحب! مجھے تو معاف کیجئے اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں (مراد ذوق) وہ اپنی اُمت کو لے کر چڑھ آتے ہیں۔ شعر سمجھنے کی تمیز نہیں مفت میں واہ واہ۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت کو منغض کر دیتے ہیں[2]۔

اساتذہ خاموش بھی رہیں مگر ان کے شاگرد آپس میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش میں طنز اور فقروں سے مشاعرہ کو غیر ادبی بنا دیتے مگر اساتذہ کا عام طور سے رویہ سنجیدہ اور متین ہوتا تھا۔

اگر تاریخ ادب پر نظر ڈالیں تو بعض اساتذہ کے یہاں تلامذہ کی طویل فہرست ملے گی۔ مثلاً نصیر، ناسخ، مصحفی، ذوق اور داغ وغیرہ۔ کچھ وہ اساتذہ ہیں جنھوں نے ہمیشہ اپنے اور دوسرے شعرا کے درمیان فاصلہ رکھا۔ اس لیے ان کے یہاں گنتی کے شاگرد نظر آئیں گے۔ جن میں ایک مومن خاں بھی ہیں۔ غالب کے یہاں تلامذہ کی وہ طویل فہرست تو نظر نہیں آئے گی جن کا ذکر پہلی صف میں آیا مگر ان کے یہاں مختلف مزاج کے لوگوں کا اجتماع نظر آئے گا۔ ہر مسلک اور مزاج، ہر پیشہ اور ہنر کا واقف کار اس محفل میں غالب کے گرد نظر آئے گا۔ غالب کے یہاں جو تنوع ہے اس کا ایک سبب ان کی ذاتی صلاحیت ہے اور دوسرے مزاج کی شگفتگی ہے۔ اس رنگا رنگ محفل کا اثر غالب کی زندگی پر بھی پڑا ہے جاگیردارانہ مزاج کے باوجود اپنے

---

[1] آب حیات۔

[2] دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ۔

عہد کے دوسرے شعرا کے مقابلے میں وہ عوام سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔

عہد حاضر میں استاد اور شاگردی کی روایت اور مشاعروں کی رسم دونوں کا زوال ہے۔ یہ دونوں چیزیں اب تجارت کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ اس سے قطع نظر شاعر اور سامعین آدابِ محفل کو بھی فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ شاعر متبذل اشعار پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے محفل کو زعفران زار بنا دیتا ہے مگر یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے شاگرد اور سامعین کے ذہن پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ کسی قوم کی ترقی کے ضامن نہیں ہو سکتے۔ مشاعروں کی داد اب بے داد بنتی جا رہی ہے۔ نتیجہ کے طور پر سخن شناسوں کو سکوت اختیار کرنا پڑتا ہے۔

مومن اسکول

ہیئت اور موضوع کا ارتباط

جذبات اور خیالات نے ہر زمانہ میں حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ کو متشکل اور متعین کرنے میں حصّہ لیا ہے اور یہی دو عوامل ہیں جن کو شاعری کی بنیاد مانا ہے۔ ہم کچھ محسوس کرتے ہیں، یا سوچتے ہیں اور اس محسوس کرنے اور سوچنے کے نتیجہ کو شعر کہا جاتا ہے۔ لیکن شعر کی تخلیق اس وقت تک ناتمام ہے جب تک اس کے لیے ایک پیرایہ بیان میسر نہ آئے۔ اس لیے صاحب مراۃ الشعر کا قول ہے کہ "اچھا شعر حسن الفاظ، حسن خیال اور حسن ادا کا مجموعہ ہے"۔ ایک مؤثر جذبہ یا ایک عمدہ خیال اور الفاظ میں باہم کیا تعلق ہے، اس کی وضاحت کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم علامہ شبلی کی رائے پیش کردیں جو ابن رشیق کی کتاب العمدہ سے ماخوذ ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> "لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے۔ دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط کہ وہ کمزور ہوگا تو یہ بھی کمزور ہوگی۔ پس اگر معنی میں نقص نہ ہو اور لفظ میں ہو تو شعر میں عیب سمجھا جائے گا۔ جس طرح لنگڑے یا لنجے میں روح موجود ہوتی ہے لیکن بدن میں عیب ہوتا ہے اسی طرح اگر لفظ اچھے ہوں لیکن مضمون اچھا نہ ہو تو تب بھی شعر خراب ہوگا اور مضمون کی خرابی الفاظ پر بھی اثر کرے گی۔ اگر مضمون بالکل لغو ہو اور الفاظ اچھے ہوں تو الفاظ بھی بیکار ہوں گے۔ جس طرح مردہ کا جسم کہ یوں دیکھنے میں سب کچھ سلامت ہے لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں۔ اس طرح مضمون اچھا ہو الفاظ اگر برے ہیں تب بھی شعر بیکار ہوگا کیونکہ روح بغیر جسم کے پائی نہیں

جا سکتی ہے[1]"

آگے بڑھ کر شبلی کہتے ہیں۔

"اہل فن کے دو گروہ بن گئے ہیں ایک لفظ کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی تمام تر کوشش الفاظ کے حسن و خوبی پر مبذول ہوتی ہے۔ عرب کا اصلی انداز یہی ہے۔ بعض لوگ مضمون کو ترجیح دیتے ہیں اور الفاظ کی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ ابن الرومی اور متبنی کا مسلک ہے لیکن زیادہ تر اہل فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح دینے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں لیکن شاعری کا معیار کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے اور بندش کیسی ہے[2]"

الفاظ کی اہمیت

اوپر کی بحث سے واضح ہوا ہوگا کہ شعر کا دارومدار مضمون اور الفاظ دونوں پر ہے لیکن جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس میں مضمون سے زیادہ الفاظ کا کھیل ہے۔ سوچنے اور خیال کرنے کی حد تک شاید ایک فلسفی شخص شاعر سے سبقت لے جائے لیکن حسنِ الفاظ وحسنِ بیان کی قلمرو میں فلسفی کا دخل نہیں وہاں اگر کسی کا سکّہ چلتا ہے تو وہ صرف شاعر یا ادیب کا۔ ہومر، درجل، امراء القیس، فردوسی، میر، تلسی داس وغیرہ نے دنیا کے فکری سرمایہ میں اس قدر اضافہ نہیں کیا جتنا بیان وزبان کے ذخیرہ میں، غرض شاعری میں لطف خیال سے زیادہ لطف بیان شرط ہے۔

سب جانتے ہیں کہ خیال کی دنیا غیر محدود ہے اور بے مثال وسعت رکھتی ہے۔ جو معینہ اصول، کتابی قواعد اور بندھے ٹکے ضوابط کی پابند نہیں ہے۔ اس میں درحقیقت وہبی صلاحیتوں کا کام ہے نہ کہ اکتسابی قوتوں کا اس لیے خیال کی حدود تک شاعری میں استادی و شاگردی کوئی

---

[1] شعر العجم حصّہ چہارم ص ۷۲

[2] " " " ص ۷۳

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) ۱۴۵۲ء

© پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

سنہ اشاعت :———— ۱۹۹۶ء
قیمت :———— ۱۰۰ روپے
بہ اہتمام :———— اختر زماں
طباعت :———— ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

DABISTAN-E-MOMIN

EDITED BY PROF. ZAHEER AHMED SIDDIQUI

PRICE Rs. 100

1996

ISBN-81-7160-073-5

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
URDU GHAR : 212 ROUSE AVENUE
NEW DELHI-110002

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

معنی نہیں رکھتی۔ ہوسکتا ہے کہ ایک اچھوتا خیال یا ایک لطیف مضمون ایک مشاق استاد کے ذہن میں نہ آئے اور ایک مبتدی شاعر کو سوجھ جائے لیکن زبان و بیان۔ انتخاب الفاظ و تراکیب قواعد فن، صحت محاورات چستی بندش یہ ایک ایسی چیزیں ہیں جو صحیح رہنمائی اور طویل مشق کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں۔ اس لیے علامہ اقبال نے فرمایا ہے "ہر شخص کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے"

قدیم اہل فن کا نظریہ

اس سلسلہ میں بدقسمتی سے ہمارے ملک میں صحیح اور متوازن طریق عمل کم اختیار کیا گیا ہے۔ ایک طرف ہمارے قدیم اہل فن تھے جو ایک اچھے شعر کے لیے صرف اس قدر دیکھنا ضروری سمجھتے تھے کہ الفاظ میں فصاحت ہے۔ محاورہ درست ہے۔ بندش چست ہے۔ معنی و بیان کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ وزن قافیہ کا کوئی سقم تو نہیں ہے۔ صنائع و بدائع کی کہاں تک رعایت ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی حرف تقطیع سے گر گیا "ی" یا "و" شعر میں دب رہے ہیں۔ تذکیر و تانیث مشتبہ ہے یا محاورہ ٹکسال باہر ہے تو سمجھتے تھے کہ قیامت آگئی۔ شاعر کتنا ہی عالی مرتبہ، شعر کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو اہل فن کی نظر سے گر جاتا تھا۔

جدید اہل فن کا نظریہ

اس کے برخلاف دور جدید کے تنقید نگاروں نے شعری تجزیہ، نفسیاتی تحلیل، شعور اور لاشعور کی بحث پر انتہا سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان کی تمام تر سعی اس پر مرکوز ہوتی ہے کہ فلاں ادیب یا شاعر کا ماحول کیسا تھا۔ اس کے خیالات و جذبات کی تشکیل میں کون کون عوامل کارفرما تھے۔ اس کے فن کے پس منظر اس کے موضوع کے عناصر ترکیبی۔ اس کے پیغام کا دائرہ فکر و عمل کیا نوعیت رکھتا تھا۔ اس نے کس حد تک اپنے گرد و پیش سے اثر لیا یا اس پر اثر ڈالا وغیرہ وغیرہ۔ ان حضرات کو فن کی صحت و سقم اور زبان و بیان کے حسن و قبیح سے چنداں سروکار نہیں ہوتا۔ چنانچہ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں۔

"ترقی پسند ادیب کا زاویہ نظر مواد اور ہیئت کے تعلق کے بارے میں بہت واضح ہے۔ وہ تمام شعرا اور نقاد جو زندگی کو نامیاتی مانتے ہیں جو مقدار سے خصوصیتوں کو بدلنے کے قائل ہیں جو شاعری کو زندگی کا مظہر مانتے ہیں جو ادب کو سماجی ترقی کا ایک آلہ سمجھتے ہیں اور جو تمدن کو عام کرنا اور فنون لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ہیئت اور اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ ترقی پسند شاعروں کا خیال ہے کہ دنیا کو ترقی کی راہ دکھانے میں ادب کا بھی ہاتھ ہے اور یہ رہنمائی ہیئت سے نہیں صحت بخش خیال ہی ہو سکتی ہے۔ ہیئت کا کام یہ ہے کہ وہ خیال اور مواد کو بہترین شکل میں پیش کر دے۔ اگر شاعر بہترین شکل کی جستجو میں مبہم غیر واضح یا محض صناع ہو کر رہ جائے تو اس نے اچھا ادب پیدا نہیں کیا۔"[1]

ہمارے خیال میں یہ دونوں طریقے افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ صحیح تنقید ان دونوں کے مناسب امتزاج کا نام ہے۔ ایک اچھے شاعر یا ادیب سے ہم بجا طور پر توقع کرتے ہیں کہ وہ ایک لطیف خیال یا جذبہ کو حسین پیرایہ میں ہمارے سامنے پیش کرے۔ اس کی مثال ایسے شیریں و سرد پانی کی ہے جو پاکیزہ و صاف پیالہ میں پیش کیا جائے۔

مومن کا ان کے تلامذہ پر اثر

مومن کا دور ظاہر ہے کہ وہ دور تھا جب خیال سے زیادہ زبان اور مفہوم سے زیادہ اس کا پیرایہ بیان اہمیت رکھتا تھا۔ اوپر آپ نے ملاحظہ کیا کہ شاعر کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے اور یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ زبان اکتساب کے بغیر نہیں آتی۔ اہل فن کی صحبت اساتذہ کے شواہد و نظائر کا تتبع۔ لغت و قواعد کی تحقیق۔ محاورات و تراکیب کی صحت اور ان سب پر مستزاد ایک شفیق استاد کی رہنمائی اس دور میں ناگزیر تھی یہی وجہ

---

[1] تنقیدی جائزے۔ احتشام حسین۔ ص ۱۳۳

ہے کہ ہم اس عہد کے چند خوش گو شعرا کے نام تلامذہ مومن میں پاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ تو مومن کی آزاد مزاجی کی وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ انھوں نے اپنے دوسرے نامور معاصرین ذوق و غالب سے عمر کم پائی اور ان سے بیشتر سفر آخرت کیا۔ ان کا حلقہ تلامذہ زیادہ نہیں ہے تذکروں میں ہم متعدد شعر کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ وہ اولاً مومن کے دائرہ تلمذ میں داخل ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد غالب کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ مثلاً شیفتہ، سالک، بیتاب ناظم، سروش۔ بہرحال مختلف قلمی و مطبوعہ تذکروں کے تفحص سے ہم جس قدر تلامذہ مومن کا سراغ لگا سکے ہیں ان کے مختصر حالات اور نمونہ کلام آئندہ پیش کیے جائیں گے۔ اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مومن اسکول کی خصوصیات پر کسی قدر روشنی ڈالی جائے کہ یہ حضرات کس حد تک مومن سے متاثر ہیں اور کس حد تک اپنے عہد کے رنگ کے اثر سے انھوں نے اپنی شاعری کے نخل میں برگ و بار پیدا کیے۔

تغزّل

اس سلسلہ میں پہلی خصوصیات جو بطور قدر مشترک سب (تلامذہ مومن) کے یہاں ملتی ہیں اور جو انھوں نے مومن سے ورثہ میں پائی ہیں تغزل ہے۔ تغزّل جیسا کہ سب واقف ہیں۔ غزل سے مشتق ہے جو حکایت از معشوق سے عبارت ہے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ یہ وصف دوسرے شعرا کے یہاں مفقود ہے البتہ یہ واقعہ ہے کہ زمانہ کے اثر سے ان حضرات نے تصوف و اخلاق کی طرف بھی توجہ کی ہے لیکن تغزل کا عنصر ان کے یہاں نمایاں ہے۔ سیماب اکبرآبادی نے تغزل کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"تغزّل کا تعلق انسان کی لطیف ترین روحانیت اور نفسیات سے ہے۔ حسن و عشق، یاس و امید، وصل و فراق۔ انتظار و کامیابی اور اسی قسم کی فطری حالتوں کی گہرے تاثر کے ساتھ مصور کرنے کا نام تغزل ہے۔"

تلامذۂ مومن کے یہاں تغزل کے نمونے دیکھنا ہیں تو یہ اشعار ملاحظہ ہوں

برق ——— آج ارمان میرے دیدہ تر کا نکلا
کہ ہر اک اشک لیے لختِ جگر کا نکلا

" ——— ہم تو کہتے تھے کہ جنّت میں لگے کا کیا جی
بارے کچھ اس میں بھی نقشہ ترے گھر کا نکلا

تسکین ——— تھا میری طرح غیر کو بھی دعوے الفت
ناصح تو اسے دینے کو الزام نہ آیا

" ——— تسکین کروں کیا دل مضطر کا علاج اب
کم بخت کو مر کر بھی تو آرام نہ آیا

آشفتہ ——— عاشق کو لطف سے ہے فزوں لطف جور میں
یہ غیر کی سزا ہے ہماری سزا نہیں

قلق ——— جیتے رہے ہیں مردن دشوار کے لیے
مرتے رہے ہیں عمر بھر انداز یار پر

" ——— کیوں کر وہ آئے یار ہے دشمن تو کچھ نہیں
سامانِ زندگی ہے مرا انتظار پر

اسی کے ساتھ مومن کی طرح معاملہ بندی کے اشعار جا بجا نظر آتے ہیں اور یہ امر قابلِ اطمینان ہے کہ ایسے اشعار میں متقدمین کا سا ابتذال نہیں پایا جاتا۔ مثلاً۔

برق ——— پوچھا جو اس نے آپ ہمیں چاہتے ہیں کیا
بے ساختہ زباں سے مری "ہاں" نکل گیا

تسکین ——— کہتے ہیں رنجش ظاہر میں مزا آتا ہے
یونہی تم مجھ سے کبھی ہو کے خفا مل جانا

" ——— شب وصال میں سنتا پڑا فسانۂ غیر
سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے

نسیم ——— منہ میرا نہ کھلواؤ کہ ہو جائیں گے لب بند
دیکھو یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

نازک خیالی

دوسرا نمایاں وصف نازک خیالی ہے۔ یہ کبھی تو اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ خیال ہی نازک ہو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بات پیچیدہ انداز سے کہی جائے یا ایک وسیع خیال کے متعدد کڑیوں میں سے چند کا ذکر کیا جائے اور باقی سامع کے ذوق پر چھوڑ دیا جائے، ذیل کی مثالیں ہمارے دعوے کی تائید کے لیے کافی ہوں گی۔

آشفتہ ——— عاشق کو لطف سے ہے فزوں لطف جور میں
یہ غیر کی سزا ہے ہماری سزا نہیں

اصغر ——— شکر جفا نے کام کیا لطف کا کہ اب
دشمن امیدوار ہے ان کے عتاب کا

〃 ——— اس ناز کی یہ اس سے تو ہرگز نہ ٹوٹتا
اصغر وفا کا عہد ہی ناپائیدار تھا

〃 ——— وہ وہ دعائیں رشک میں کی ہیں کہ اے خدا
توبہ ہے گر قبول کا دروازہ باز ہو !

اکبر ——— اکبر تباہ دیکھ کے دشمن کو ہنس دیا
اس بے وفا کو مجھ سے محبت کہیں نہ ہو

برق ——— کس واسطے خوش آئی تجھے دل کی خرابی
اے خانہ برانداز یہ تیرا ہی تو گھر تھا

تسکین ——— کہتے ہیں رنجش ظاہر میں مزا آتا ہے
یونہی تم مجھ سے ذرا ہو کے خفا مل جانا

شیفتہ — یکتا کسی کو ہم نے نہ دیکھا جہان میں
طول امل جواب ہے زلف دراز کا!

" ——— اس سے میں شکوہ کی جا شکر ستم کر آیا
کیا کروں تھا مرے دل میں سوز باں پر آیا

" ——— کب ہمیں حاجت پرہیز پڑی
غم نہ کھایا تھا کہ سم یاد آیا،

اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ تلامذہ مومن کے یہاں خیال کی نزاکت میں وہ پیچیدگی نہیں ہوتی کہ شعر چیستان بن کر رہ جائے۔ مومن کے یہاں گاہے گاہے کافی اغلاق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً

——— واعظ بتوں کو خلد میں لے جائیں گے کہیں
ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

——— بیزار جان سے جو نہ ہوتے، تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری، مدعی سے ہم

——— عدو اس اوج پہ شاکی ہے شاید غصہ آجائے
ملادے خاک میں یہ تو بھی شکر آسماں کیجئے

لیکن ان کے تلامذہ کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ ہر چیز کی طرح ادب اور اسالیب ادب میں بھی ارتقا کارفرما رہتا ہے اسی کا اثر ہے کہ جوں جوں زمانہ بڑھتا گیا یہ رنگ اور نکھرتا گیا جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہو گا اور جیسا کہ شیفتہ کے بیان سے ظاہر ہے:-

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنے شگفتہ، لفظ خوش۔ انداز صاف ہو

تراکیب کی ندرت

ہم دیکھتے ہیں کہ صنائع و بدائع کا استعمال ان حضرات کے کلام میں زیادہ سے

زیادہ اتنا ہے جتنا آٹے میں نمک۔ دہلی والے کسی زمانہ میں ایہام گوئی پر مائل رہے ہوں تو رہے ہوں مدّت سے اس روش کو ترک کر چکے تھے۔ یہ درست ہے کہ مومن کبھی اس بدعت کا ارتکاب کر لیتے ہیں مگر یہ ان کا مخصوص رنگ نہیں ہے۔ ان کے تلامذہ کے دور میں یہ طریقہ تقریباً بالکل موقوف ہو گیا۔ البتہ فارسی کی بندشیں اور لطیف ترکیبیں ان لوگوں کے یہاں بھی نظر آتی ہیں اور شعر کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں

شوق پتیدن، شکر جفا، نفس آتشیں، گرم خوئی، نفخ صور، گرہ نامہ آہو۔ ساکنان نُہ فلک، قصہ سوز دروں، تلخ آب الم، بود و نابود جہاں، بلبل تصویر، دل سختیاں، سرناصیہ فرسا، تبسم فزا، عزم لوشا لوش، افسانہ ریز آرزو، گلہ بے سبب، بوالہوس پرست، مایوس کرم، سرمہ آواز، مژگان برگردیدہ، رنج افزائے طبع نازک جاناں، مردن دشوار، صرف بزم سور، نگاہ نرگس بیمار، رخنہ زخم ہر خدنگ

برق ——— بتوں کی گرم خوئی سے دل عشاق جلتے ہیں
ہمیں تو سرد مہری نے تمہاری مہرباں پھونکا

" ——— واجو گلشن میں ترا عقدہ گیسو ہو جائے
غنچہ غنچہ گرہ نامۂ آہو ہو جائے

تکیں ——— ساکنان نُہ فلک پر دیکھئے کیسی بنے
نالہ سوزاں کا ہے اب کے ارادہ دور کا

شورش ——— کیا جانے عدو خونِ جگر پینے کی لذت
شورش سے مزا پوچھئے تلخ آب الم کا

موجد ——— ہے اب کے سال یہ فصل بہار عالم گیر
کہ خود بہ خود ہے نوا سنج بلبل تصویر

کرم ——— نام کب آسودگاں لیں نالہ ہائے زار کا
سرمہ آواز ہے سایہ تری دیوار کا

وحشت ——— بسکہ رنج افزائے طبع نازک جاناں نہیں
آسماں پر ہے دماغ اس آہ بے تاثیر کا

" ——— نازکی سے کسب طاقت ناتوانی دیکھنا
جان آتی ہے نگاہ نرگس بیمار سے

" ——— تیر پہ تیر ناز کا دل پہ مرے گزار تھا
رخنہ زخم ہر خدنگ دیدۂ انتظار تھا

شیفتہ ——— سجدے کی کسی در پہ تمنّا نہیں رکھتے
گردن پہ سر ناصیہ فرسا نہیں رکھتے

یہ ایسی ترکیبیں ہیں جو ایک طرف اختصار اور دوسری طرف زور کلام کی حامل ہیں اور اس کے ساتھ شعر کی لطافت و متانت کی بھی ضامن ہیں۔

دل چسپ واقعہ

کلام مومن کی بحث میں آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ اس دور میں لکھنؤ میں ناسخ کا طوطی بولتا تھا اس کی صدائے بازگشت دلی کے در و دیوار سے ٹکرائی تھی۔ چناں چہ غالب مومن نے بھی شروع شروع میں اس رنگ کی پیروی کی۔ اردو کی خوش قسمتی تھی کہ جلد ہی غالب رنگ میر کی طرف متوجہ ہو گئے اور مومن نے اپنا مخصوص اسلوب اختیار کیا۔ اس کا اثر ہے کہ مومن تو درکنار ان کے تلامذہ کے یہاں بھی خارجی شاعری، سطحی مضمون آفرینی اور بازاری ضلع جگت نہ ہونے کی برابر ہے۔ ذیل کا واقعہ ہمارے دعوی کے لیے کافی ہے ـــ رام پور کے ایک مشاعرہ میں جس کی صدارت صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا کر رہے تھے، امیر اللہ تسلیم بھی شریک تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا اور شمع کا دور تسلیم تک پہنچا۔ اول تو تسلیم نے معذرت کی مگر جب لوگوں کا اصرار ہوا تو انھوں نے اپنی غزل پڑھی۔

یادگار ہستی موہوم ہم رکھتے نہیں
صورت عمر رواں نقش قدم رکھتے نہیں

ایک صورت پر بسر کرتے ہیں زیرِ آسماں
صورتِ ماہِ دو ہفتہ بیش و کم رکھتے نہیں

تسلیم فرماتے ہیں کہ مطلع جس وقت میں نے پڑھا ہے تو شہزادہ صاحب نے پیچوان چھوڑ دیا اور ہمہ تن میری طرف مخاطب ہو گئے۔ جب غزل ختم کر چکا تو فرمایا کہ آپ کس کے شاگرد ہیں۔ میں نے کہا نواب اصغر علی خاں دہلوی (نسیم) کا فرمایا وہ کس کے شاگرد ہیں میں نے کہا مومن خاں دہلوی کے۔ یہ سُن کر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا میں یہی تو کہتا تھا کہ لکھنؤ والے اس رنگ میں کہنا کیا جانیں۔ وہ تو انگیا کرتی کا مضمون خوب کہتے ہیں[1]

مومن کے مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھ کر ہر شخص کو ان کی صحیح المذاقی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

——— توبہ گنہِ عشق سے فرمائے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

——— مے نہ اتری گلے سے جو اس بن
مجھ کو یاروں نے پارسا جانا

——— حال دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جُدا نہیں ہوتا

——— خون چھپانے کو میری لاش سے کہتا ہے وہ شوخ
مجھ کو یہ غم ہے کہ میں کیوں ترا قاتل نہ ہوا

——— میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

——— ڈوبا ہو کوئی آہ کنارے پہ آگیا
طغیانِ بحرِ عشق ہے ساحل کے آس پاس

---

[1] دفترِ خیال (مطبوعہ دیباچہ) امیر اللہ تسلیم۔ ص ۸

اِنتساب

شاعری کی اُن قدروں کے نام

جن سے غزل عبارت ہے۔

اُسی سے ہندوستان کو ہم مینا سمجھتے ہیں۔

——— کچھ قفس میں ان دونوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا!
——— چلی شوخی نہ کچھ باد صبا کی
بگڑنے پر بھی زلف اس کی بنا کی

تلامذہ کے یہاں رنگ مومن

اسی کے ساتھ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ مومن کے بعض تلامذہ پر رنگ مومن اس قدر چھایا ہوا ہے کہ بعض وقت دونوں میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ خیال و زبان کو دیکھ کر ایک خالی الذہن شخص بے ساختہ پکار اُٹھے گا کہ مومن بول رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی اس کو تلامذہ مومن کے یہاں انفرادیت کی کمی پر محمول کرے مگر ہم تو اس کو طرز مومن کی مقبولیت کا کرشمہ کہیں گے۔

مومن ——— نہ جاؤں گا کبھی جنّت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا
برق ——— ہم تو کہتے تھے کہ جنّت میں لگے گا کیا جی
بارے کچھ اس میں بھی نقشہ ترے گھر کا نکلا
مومن ——— آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالحوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
شیفتہ ——— ہر شیوہ سے ٹپکے ہے ادا ناز تو دیکھو
ہر بات میں اک بات ہے انداز تو دیکھو
" ——— اے مرگ آ کے میری بھی رہ جائے آبرو
رکھا ہے اس نے سوگ عدو کی وفات کا
مومن ——— کس کو ہے ذوق تلخ کامی لیک
جنگ بن کچھ مزا نہیں آتا!

تسکین ——— کہتے ہیں رنجش ظاہر میں مزا آتا ہے
یونہی تم مجھ سے ذرا ہو کے خفا مل جانا

مومن ——— بچاؤں آبلہ پائی کو کیوں کر خارِ ماہی سے
کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں وقت کا

قلق ——— خلش جائے تو کیا جائے کہ خلجان اور باقی ہے
بچایا آبلہ پائی سے میرے خارِ ماہی کو

مومن ——— اب اور سے لو لگائیں گے ہم !
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم !

اکبر ——— خانہ غیر میں گر لگنے لگا دل تیرا
مجھ کو بھی اور سے آتا ہے لگانا دل کا

مومن ——— ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب
غیر اور تم بھلے بھلا صاحب

آشفتہ ——— غیر اچھا ہے یا برے ہیں ہم
آپ ہی دل سے پوچھئے صاحب

مومن ——— کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

نسیم ——— منہ میرا نہ کھلواؤ کہ ہو جائیں گے لب بند
دیکھو یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مومن ——— رشک پیغام ہے عناں کشِ دل
نامہ بر راہبر نہ ہو جائے

اکبر ——— ہوا نہ شوق سے اس کوچہ میں گزر اپنا
ہمیشہ پیچھے رہا ہم سے راہبر اپنا

وہ غزلیں جن میں یکساں ردیف قافیے اختیار کیے گئے ہیں:۔

مومنؔ ـــــــ تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں!
بے چارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

شیفتہؔ ـــــــ آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

مومنؔ ـــــــ آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

شیفتہؔ ـــــــ ہر شیوہ سے ٹپکے ہے ادا ناز تو دیکھو
ہر بات میں اک بات ہے انداز تو دیکھو

مومنؔ ـــــــ گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہو گا
حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

تسکینؔ ـــــــ چُپ لگی ہم کو تو چرچا یہی پھر واں ہو گا
راز اپنا نہ خموشی سے بھی پنہاں ہو گا

مومنؔ ـــــــ دُعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لیے
سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لیے

غمگینؔ ـــــــ کمی کریں جگر و دل تو کیا کروں یارب
کچھ اور دے مجھے مژگانِ خونفشاں کے لیے

مومنؔ ـــــــ اگر غفلت سے باز آیا جفا کی!
تلافی بھی کی ظالم نے تو کیا کی

موجدؔ ـــــــ کہاں میں کہاں ترکِ محبت
نصیحت کی بھی ناصح نے تو کیا کی

مومنؔ کی صدائے بازگشت

وہ اشعار جن میں مومن کی صدائے بازگشت سُنائی دے رہی ہے۔ وہی اندازِ ہی

تیور وہی ترکیبیں۔

تسکین ——— دل دینے کی قتل ہی سزا ہو
قائل ہیں تمہاری منصفی کے !

〃 ——— کیا تجھ سا دکھا دیا ہے بدخو
کیوں ٹکڑے کئے ہیں آرسی کے

〃 ——— ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی !

قلق ——— خلش جائے تو کیا جائے کہ خلجان اور باقی ہے
بچایا آبلہ پائی سے میرے خارِ ماہی کو

〃 ——— بڑھتا ہی جائے گا میرے سینہ میں خون گرم
رگ رگ میں لاکھ لاکھ فرو نیشتر کریں

شیفتہ ——— رات واں گل کی طرح سے جسے خنداں دیکھا
صبح بلبل کی روش ہم دم افغاں دیکھا

اکبر ——— ہم مر گئے اور اس نے نہ جانا کہ مر گئے
ہر زخم پر جو ہلتے تھے لب آفریں کے ساتھ
واں رسم اختلاط سے انکار و عذر تھا
یاں جان ہی نکل گئی اپنی، نہیں کے ساتھ

صاحب ——— کھولے ہیں اس نے پیرہن یوسفی کے بند
تہ کر رکھے نسیم سے کہہ دو قبائے گل

صغیر ——— ہوا ہو سہو تو پھر خوب یاد کر لیجئے
کہ رہ نہ جائے کوئی جورِ امتحاں کے لیے

تلامذہ مومن کا اضافہ

تلامذہ مومن کا رنگ مومن سے اس قدر متاثر ہونا جس کی مثالیں اوپر ملاحظہ سے

گزریں، اس امر کو ملتزم نہیں کہ ان لوگوں نے استاد کی نقالی پر اکتفا کیا اور چبائے ہوئے نوالوں کو دوبارہ چبایا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کے یہاں وہ رعنائی خیال اور لطافت بیان ملتی ہے جو شعرائے دہلی کا سرمایہ ناز ہے یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں لطیف تغزل کی چاشنی ہے جو مومن کا فیضان ہے مگر اس کے ساتھ ہی ان کے کلام میں ایسے برگ و بار بھی نظر آئیں گے جو زمانہ کے ارتقائی حالات کا نتیجہ ہیں۔ یہ انداز بیان اپنے اندر ایک طرح کی انفرادی شان رکھتا ہے جس کو نہ شاہ نصیر کی سنگلاخ ردیف و قافیہ پیمائی سے نسبت ہے نہ ناسخ کی لفاظانہ صناعی سے۔ اور نہ ذوق کی محاورہ بندی سے لگاؤ ہے۔ نہ غالب کی دور از کار مضمون آفرینی سے۔ یہ برگ و بار جن کا اوپر ذکر ہوا ہے عنوانات ذیل کے تحت پیش کیے جا سکتے ہیں۔

تصوف

مومن ایک سچے عامل بالحدیث کی حیثیت سے تصوّف کے مخالف ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس صنف کو اختیار نہیں کیا بلکہ موقع بہ موقع اپنے طنز و تعریض کا نشانہ بنایا۔

مثلاً:

——— ہم بندگی بت سے نہ ہوتے کبھی کافر
ہر جائے گر اے مومن موجود خدا ہوتا

——— مومن ہے اگرچہ سب اس کا ظہور
توحید وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے
بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

ان تلامذہ میں سے بعض نے تصوف میں ڈوب کر لکھا ہے اور ایسا کہ مذاق سلیم وجد کرتا ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ ان شعرا نے تصوف کو فلسفہ نہیں بننے دیا۔ اگر صوفیانہ اصطلاحیں فلسفہ کی شکل میں سامنے آئی بھی ہیں تو ان کے مفہوم کو عام فہم بنا دیا ہے خواجہ میر درد کی طرح ان شعرا نے تصوف کو اخلاقیات کے پردے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک خیر و

شر، اچھا، بُرا پست و بُلند سب ذات الٰہی کے عکس ہیں اس لیے ان سے نفرت کرنا آدابِ تصوف کے خلاف ہے

یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا
ہاں عالم شہود ہے آئینہ ذات کا

تصوّف کے رنگ میں دوسرے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔ مثال کے طور پر اشعار ذیل پڑھئے۔

— یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا
ہاں عالم شہود ہے آئینہ ذات کا

— اکثر ہوا ہے مجھ کو سفر در وطن مگر
لایا نہ دوستوں کے لیے ارمغاں ہنوز

— پیر مغاں کے فیض توجہ سے شیفتہ
اکثر شراب پیتے ہیں روحانیوں میں ہم

برقؔ کہتے ہیں:۔

— حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے
ورنہ تو پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

— میری خاطر پھر دکھا عالم رخ پر نور کا
غش سے موسیٰ نے نہیں دیکھا ہے جلوہ طور کا

ظہورؔ کا شعر ہے:۔

ہے چاروں طرف حسن کی جس کے یہ تجلّی
وہ شاہد یکتا نہیں معلوم کدھر ہے

سالکؔ — راز کھلتے گئے زمانے پر
جس قدر اس نے خود نمائی کی

اخلاقیات

مومن کے تغزل میں اخلاقیات کی بھی گنجائش نہیں۔ وہ شاید تصوف کی طرح اس کو بھی شجر ممنوع خیال کرتے ہیں۔ کہیں کہیں اخلاقی شعران کے قلم سے نکل گئے ہیں لیکن محض مزامنہ کا بدلنے کے لیے ان کے برخلاف ان کے تلامذہ نے اس صنف میں عمدہ شعر نکالے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شیفتہ ——— یہ ہے نصیحت پیران کار افتادہ
کہ بد بلا ہے جوانی ڈور جوانی سے

" ——— اپنا ٹوٹا گھر بہت مرغوب ہے
بارگاہ ثابت دسیار سے!

" ——— تم کو نہیں جو عجب تعجب ہے شیفتہ
ہے فی زمانہ یہ تو سرشت کرام میں

ظہور ——— نہیں کچھ بود و نابود جہاں جائے غم و شادی
کہ یاں اسباب دنیا کو نہ ہرگز دیر پا دیکھا

تسلیم ——— بہت مشکل ہے رہنا پاکدامن لوث دنیا سے
اُلجھ کر رہ گیا جو وادی پرخار میں آیا

راسخ ——— میں بنائے جہاں سہی لیکن
جب کہ ناپائیدار ہوں کیا ہوں

سلاست وصفائی

اس میں شک نہیں کہ مومن کے یہاں ممتنع کی مثالیں کثرت سے موجود ہوں۔ مگر اس کے باوجود ان کے یہاں اغلاق و اشکال کی بھی کمی نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ہر غزل میں تقریباً آدھے شعر شرح کے محتاج ہیں۔ تلامذہ مومن نے استاد کے رنگ کو اس قدر شستہ و رفتہ کیا

ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تند و تیز سیال پہاڑی سے نکل کر میدان میں آکر سبک سیر بن گئی ہے۔ مثالیں کہاں تک دی جائیں چند شعر نمونہ کے طور پر پیش ہیں۔

وحشت ——— میرے مرنے کی خبر غیر کو یوں دیتے ہیں
مر گیا وحشت جاں باز تری جان سے دور

آہی ——— تمہارے حسن میں گرمی کہاں ہے
اگر ہووے تو وا بند قبا ہو

شیفتہ ——— بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر
یہ اہل مروت ہیں تقاضہ نہ کریں گے

تسکین ——— ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

سالک ——— رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک
آگئی عمر پارسائی کی !

برق ——— پوچھا جو اس نے آپ ہمیں چاہتے ہیں کیا
بے ساختہ زباں سے مری ہاں نکل گیا

تسکین ——— اب یہ حالت ہے کہ ان سا ہیدرد
میرے بچنے کی دعا مانگے ہے

تلامذۂ مومن

یہ مقالہ تشنہ رہ جائے گا اگر یہاں مومن کے شاگردوں کے حالات اور کلام سے صرف نظر کیا جائے۔ اس لیے جو کچھ تھوڑا بہت سرمایہ تذکروں اور تاریخوں کی ورق گردانی سے دستیاب ہوا اس کو پیش کیا جاتا ہے۔

آشفتہ۔ حکیم منور علی۔ ولادت سنہ ۱۸۰۸ء/۱۲۲۳ھ وفات سنہ ۱۸۴۸ء/۱۲۶۵ھ

حکیم منوّر علی خلف سید علی نواز رضوی خاندان سادات بارہہ کے ممتاز چشم وچراغ تھے۔ ان کی ولادت شاہ جہاں آباد (دہلی) میں ہوئی۔ مزاج میں آشفتہ سری اور طبیعت میں شوریدگی تھی۔ یہی سبب تھا کہ تخلص بھی آشفتہ رکھا۔ ابتدا سے طبابت سے ذوق تھا یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو فن طب میں دہلی کے مشہور حکیم غلام حیدر خاں سے اکتساب فیض کا موقع حاصل ہوا۔ آخر صدر الصدور کے محکمے میں ڈگری نویس کا عہدہ ملا۔ صاحب خمخانہ جاوید کا بیان ہے کہ ۱۸۴۸ء میں ان کی عمر چالیس برس تھی اس اعتبار سے ان کا سال پیدائش ۱۸۰۸ء ہے[1]

آشفتہ اپنی شوریدہ مزاجی کے باوجود نہایت طباع اور ذہین تھے ان کے متعلق شیفتہ لکھتے ہیں۔

"در فنِ طب دستے بلند و پایہ عالی دارد استفادہ ایں فن از خدمت حکیم غلام حیدر خاں

---

[1] مصنف طبقات الشعرا ہند نے اپنے اور آشفتہ کے ملنے کا تذکرہ طبقات الشعرا میں ۱۸۴۶ء میں کیا ہے اور طبقات الشعرا کی تالیف کے وقت کریم الدین نے ان کی عمر چالیس سال بتائی ہے اس اعتبار سے خمخانہ جاوید اور طبقات کی بتائی عمر میں صرف ایک سال کا فرق ہے۔

کہ از مشاہیر اعیان دہلی ست نمودہ با تیر تخلص آشفتہ مزاج و شوریدہ طبع نمکے از سوز عشق در خمیر ش افتادہ۔[1]"

مومن خاں کے شاگردوں میں سے تھے ان کے بعد شیفتہ سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ ان کا دیوان نہیں ملتا۔ مختلف تذکروں میں جو کلام دستیاب ہوا وہ پیش کیا جاتا ہے۔ شاعری کا معیار خاصہ بلند ہے۔ کہیں کہیں مومن کی شوخی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

جو نامہ برگیا وہ گیا جان سے وہاں
اب جی میں ہے رقیب کو ہم نامہ بر کریں

آشفتہ تیری گور میں تڑپے ہے ساری خلق
ہے بے قرار آمد محشر کو جان کر

تم غیر سے ملے میں کسی سے ملا نہیں[2]
سچ ہے کہ بے وفا ہوں میں تم بے وفا نہیں

عاشق کو لطف سے ہے فزوں لطف جور میں
یہ غیر کی سزا ہے ہماری سزا نہیں

نے قتل کا خیال انھیں اور نہ موت کا
قسمت میں کیا خدا مرے مرنا لکھا نہیں

ہے وصل میں بھی فراق کا غم
ظاہر میں ہوں پاس پر جدا ہوں،

آوارہ ہوں آپ پر جہاں کو
میں خضر کی طرح رہ نما ہوں

---

[1] گلشن بیخار ص ۱۴

[2] مومن کا یہ شعر پڑھئے اور لطف اٹھایئے

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے ‏‏ میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

فہرست

حرفِ آغاز — خلیق انجم

ابتدائیہ

اُردو میں استادی شاگردی کی روایت ۴

مومن کے اسکول ۱۷

ہیئت اور موضوع کا ارتباط — الفاظ کی اہمیت

قدیم اہلِ فن کا نظریہ — جدید اہلِ فن کا نظریہ

مومن کا ان کے تلامذہ پر اثر

(الف) تغزل (ب) نازک خیالی

(ج) تراکیب کی ندرت

تلامذہ کے یہاں رنگِ مومن

(الف) رحیم الدین حیا کا واقعہ

(ب) مومن کی صدائے بازگشت

تلامذۂ مومن کا اضافہ

(الف) تصوف (ب) اخلاقیات (ج) سلاست وصفائی

تلامذۂ مومن ۳۶

آشفتہ	حکیم منور علی	بے تاب	عباس علی خاں
اصغر	اصغر علی خاں	تسکین	میر حسین
اکبر	اکبر علی خاں	تسکین	مظفر بیگ
آہی	سید عبدالرحمن	تہور	مرزا فخر الدین
برق	قاضی نجم الدین	ثردت	محمد بخش

——— اللہ رے یاوری طالع
ٹھکرا کے چلے وہ میرے سر کو

——— دیکھیں آشفتہ ہمیں مر کے بھی راحت ہوگی
یار ہے گا یہ غم و رنج و الم جان کے ساتھ

——— عش ہوں گے ہم آشفتہ تاب رخ جاناں سے
پوچھے گا قیامت میں بے ہوش سے کیا کوئی

——— ہے جلادکی سادگی میں بھی شوخی
مرے خوں کو رنگ حنا جانتا ہے

——— سنا تھا ہم نے آشفتہ کہ کوئی دم کا ہے مہماں
کئی دن ہو گئے اس کو نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے

——— گر سنے ناصح کہ دشمن سے ملے ہی کس طرح
ہے یقیں تو بھی کہے وہ بیوفا کہنے کو ہیں[1]

اصغر——— صاحبزادہ اصغر علی خاں۔ ولادت ۱۸۱۹ء/۱۲۳۵ھ وفات ۱۸۵۶ء/۱۲۷۳ھ

صاحبزادہ محمد عبداللہ خاں ظریف کے صاحبزادے ہیں۔ باپ کا ذوق شعری ورثہ میں پایا۔ مزاج میں بذلہ سنجی اور خوش مذاقی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا ذکر عام طور سے تذکروں میں نہیں ملتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انھوں نے عمر زیادہ نہ پائی۔ ۱۲۷۳ھ میں اڑتیس برس کی عمر تھی کہ انتقال ہو گیا[2]۔

---

[1] خمخانۂ جاوید حصہ اول ص ۷۲ — جلوہ خضر ص ۲۴۴
طبقات الشعرا ہند ص ۲۵۸ — سخن شعرا ص ۲۹
گلشن بیخار ص ۱۴ — بزم سخن ص ۶
طور کلیم ص ۸ — گلستان سخن ص ۱۲۲

[2] یادگار انتخاب امیر احمد امیر۔ ص ۲۵

عارضۂ خناق میں مبتلا ہو کر میرٹھ میں دنیا سے سفر کیا۔ میّت کو دہلی لایا گیا اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن کیا گیا۔ شاعری میں مضامین عاشقانہ سے خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ مومن کی طرح ان کے یہاں بھی تغزل کا خاص اہتمام ہے۔ امیر مینائی یادگار انتخاب میں لکھتے ہیں:۔

"شاعر خوش مذاق ہیں۔ آفرینش مضامین عاشقانہ میں طاق ہیں۔ مومن خاں صاحب مرحوم دہلوی کے شاگرد ہیں۔ کلام ان کا لائقِ دید و قابلِ شنید"

نمونہ کلام:۔

——— شکرِ جفا نے کام کیا لطف کا کہ اب
دشمن امیدوار ہے ان کے عتاب کا

——— اس[1] نازکی پر اس سے تو ہرگز نہ ٹوٹتا
اصغر وفا کا عہد ہی ناپائیدار تھا

——— وہ دعائیں رشک میں کی ہیں کہ اے خدا
تو بہ ہے گر قبول کا دروازہ باز ہو

——— وہ کہیں گے کہ ستم اُٹھ نہ سکا
بعد مردن یہ مصیبت ہو گئی!

——— کیوں نہ گھبرا کے اُٹھیں بالیں سے میرے وقتِ نزاع
سچ ہے کب دیکھا کسی کو اس نے مرجاتے ہوئے

——— درد و غم کے سوا بھی اے اصغر
کیا کہوں میرے دل میں کیا کیا ہے

---

[1] غالب کا شعر ہے۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

——— کب یہاں تھا گزر غیر جو رسوا ہوتے
تم نے کس واسطے دل میں مرے آنا چھوڑا

——— اختیار اپنی اجل پر تو مجھے دینا تھا
گر دیا تھا میرے دشمن کو خدایا سب کچھ

——— زیست تو دشوار تھی مرنا بھی مشکل ہوگیا
کہہ گئے ہیں اپنے آنے کی وہ پھر جاتے ہوئے[1]

اکبر ——— نواب محمد اکبر علی خاں ولادت ۱۸۱۵ء/۱۲۳۱ھ وفات ۱۸۸۰ء/۱۲۹۸ھ نواب اکبر علی خاں کا تعارف سرسید اس طرح آثار الصنادید میں کراتے ہیں:-

"نخلبند حدیقہ بخت مندی نونہال گلشن طالع بلندی عارج معارج اقبال مصاعد جاہ وجلال نتیجہ ادوار فلک کارفرمائے ملک وملک یگانہ دوراں محمد اکبر خاں اکبر تخلص، برادر نواب محمد مصطفےٰ خاں بہادر"[2]

نواب اکبر علی خاں تعلقہ دار جہاں گیر آباد تھے اور شیفتہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ زیادہ تر وقت دہلی میں گزرتا تھا۔ جہاں گیر آباد بہت کم جایا کرتے تھے۔ آخر موت ان کو کھینچ کر راؤ لپیڈی لے گئی اور ۱۸۸۰ء میں وہاں انتقال ہوگیا خمخانہ جاوید میں ان کی عمر انتقال کے وقت ۶۵ سال بتائی ہے[3]۔

اکبر کو بھی اپنے بڑے بھائی شیفتہ کی طرح شعروادب سے خاص لگاؤ تھا۔ قدرت نے ذہن اور جودت طبع کا وافر حصہ ادا کیا تھا اگرچہ شعر بہت کم کہتے مگر جو کچھ کہتے تھے وہ نہایت خوب کہتے۔ سرسید جو کبھی کسی کی بیجا تعریف نہیں کرتے اکبر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ہر بیت ان کے مضمون رنگین سے دکان گلفروش، مصرعہ ان کا ناز کی کیفیت سے

---

[1] خمخانہ جاوید ص ۳۲۴۔ یادگار انتخاب ص ۲۵

[2] آثار الصنادید ص ۱۱۵

[3] خمخانہ جاوید۔ ص ۳۷۵

مینائے بادہ سرجوش۔ لطف سخن سے خط خوباں خجل اور خوبی سطور سے سنبل جنت منفعل۔"[1]

اکبر مومن خاں مومن کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اگر زندگی ساتھ دیتی تو شاید آئندہ استادان ادب کی صف اوّل میں ان کا نام ہوتا۔ اکثر ان کی غزلوں میں مومن کی صدائے بازگشت سنائی دیتی۔ یہ ان چند تلامذہ میں سے ہیں جنھوں نے استاد کے رنگ کو اپنائے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ مثلاً اکبر کے اشعار مومن کے ساتھ پڑھیئے:۔

——— خانۂ غیر میں گر لگنے لگا دل تیرا
مجھ کو بھی اور سے آتا ہے لگانا دل کا

——— ہوا نہ شوق سے اس کوچہ میں گزرا اپنا
ہمیشہ پیچھے رہا ہم سے راہبر اپنا

اکبر کا رنگ ایک خاص قسم کا گنگا جمنی رنگ ہے اور اس سے ان کی انفرادیت کا رنگ ابھرا ہے ان کا دیوان نایاب ہے۔

——— جنوں عشق کا درماں نہ ہو کسی سے کبھی
کہو علاج کرے جا کے چارہ گر اپنا
عدو کے ذکر سے واں ہوش جائے یاں موت آئے
مزاج ان سے بھی نازک ہے کس قدر اپنا

——— نالہ بے کس و مضطر میں اثر ہوتا ہے
بے وفا خوب نہیں دیکھ ستانا دل کا
سوچیئے حضرت ناصح کوئی تدبیر وصال
حیف چارہ نہ کرے آپ سا دانا دل کا

——— اثر لیلےٰ کو کیا ہو جب تری فریاد نے مجنوں
چلایا پائے ناقہ کو نہ دست ساربان پھونکا

---

[1] آثار الصنادید ص ۱۱۵۔ مطبوعہ ۱۸۹۵ء

——— دوش ملک پہ دیکھ کے نعش شہید عشق
حوروں کو یہ گمان ہے کہ عرش بریں نہ ہو
اکبؔر تباہ دیکھ کے دشمن کو ہنس دیا
اس بے وفا کو مجھ سے محبت کہیں نہ ہو

——— کون رویا ہے ترے کوچے میں رات
کیوں سفیدی اڑ گئی دیوار کی ،

——— ہم مر گئے اور اس نے نہ جانا کہ مر گئے
ہر زخم پر جو ہلتے تھے لب آفریں کے ساتھ
طوفان نوح وگریہ اکبؔر میں فرق ہے
یعنی کہ آسمان کو ڈبویا زمین کے ساتھ

——— واں رسم اختلاط سے انکار و عذر تھا
یاں جان ہی نکل گئی اپنی نہیں کے ساتھ

——— قتل کر کے لاشۂ اکبؔر کو چھپایا گھر میں
بارے اس نے مجھے جانے نہ دیا اور کہیں[1]

آہیؔ ——— سید عبدالرحمٰن ——— متوفی سنہ ۱۸۷۵ء / ۱۲۹۲ھ

سید عبدالرحمٰن نام تھا اور آہیؔ تخلص۔ یہ مومنؔ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ میر حسن تسکین کے بیٹے اور میر عبداللہ غمگین کے بھائی تھے۔ مومن خاں مومنؔ کو ان کے سے بے حد محبّت تھی۔ لہٰذا انھوں نے اپنی بھانجی کا عقد آہیؔ سے کر دیا۔ آہیؔ نے زیادہ عمر نہ پائی۔ عین جوانی میں ۱۸۷۵ء میں دنیا سے کوچ کیا۔ باپ کا تعلق رام پور سے تھا اس لیے ان کو بھی دربار رامپور سے ربط رہا اور

---

[1] آثار الصنادید ایڈیشن دوم ص ۱۱۴۔ خمخانہ جاوید حصہ اوّل ص ۳۷۵۔ جلوہ خضر ۲۴۴۔ بیاض سخن ص ـــ۔ بزم سخن ص ۱۶۔ گلشن بیخار ص ۲۴۔ طور کلیم ص ۱۲ سخن شعرا ص ۴۲۔ تذکرہ زیبا (قلمی) ص ۱۲۲۰۔ طبقات الشعراء ہند ص ۴۵۲

برابر وہاں سے وظیفہ پاتے رہے۔ مومن خاں مومن کا کلیات بھی انھوں نے ہی مرتب کیا۔
عربی فارسی کی تحصیل خاص طور پر کی تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں درسیہ کتابیں مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھیں۔ فن معمّا میں وہ مہارت بہم پہنچائی کہ اقران سے سبقت لے گئے۔
مزاج میں بے حد شگفتگی اور بذلہ سنجی تھی۔ شعر کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت خداداد تھی۔ سیرت کے اعتبار سے بھی وہ ایک فرد فرید تھے، چنانچہ خلق، مروت اور انکساران میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی۔ کلیات تو کیا مرتب ہوتا اپنے ذوق کے مطابق شعر بھی جی بھر کے نہ کہہ سکے۔ آہی کے کلام میں تسکین اور مومن کا رنگ نمایاں ہے۔ کلام میں بے ساختگی شوخی اور آمد کی فراوانی ہے۔

——— تمہارے حسن میں گرمی کہاں ہے
اگر ہوئے تو وا بند قبا ہو

——— شکوہ کہاں کا کیسا گلہ جی نکل گیا
شرما کے یار نے جو ہنی نیچی نگاہ کی

——— مژدہ اے شوق پتیدن خلق میں ہے آج دھوم
زہر میں خنجر کو وہ اپنے بجھا کر لے گئے
اٹھ کہیں، ہے آمد آمد اس ستم گر کی وہاں
اہل محفل محشر مجھ کو یہ مژدہ سنا کر لے گئے

——— واعظ خلد سے لا خانہ خمار میں رکھ
قدر داں مے کی ہے جس جا کوئی میخوار رہے

——— کھل گیا دروازہ جنت بھی اپنی گور میں
پر دل وحشی یہ کہتا ہے بیاباں چاہیئے
دل لیے جاتی ہیں حوریں نزع میں اے ہمدمو
سامنے رکھنی مرے تصویر جاناں چاہیئے

کچھ تمہیں بھی خبر ہے آہی کی
لوگ کہتے ہیں مر گئے کب کے

اور ذیل کے شعر تو بے پناہ کہہ گئے ہیں جن سے ان کا کمال فن آشکار ہے:۔

ـــــ سب کو خبر ہوئی مرے حال تباہ کی
اٹھ جائے گی اب جہان سے رسم چاہ کی

ـــــ ہے غلط دھوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر
شہر میں چاک کسی کا تو گریباں ہوتا[1]

برؔق ـــــ قاضی نجم الدین ـــــ ولادت $\frac{۱۸۲۷ء}{۱۲۴۳ھ}$ وفات $\frac{۱۸۷۵ء}{۱۲۹۲ھ}$

"کوئی بیس بائیس برس کی عمر ہے۔ سر پر لمبے لمبے بال، سانولی رنگت، اس میں سبزی جھلکتی ہوئی۔ اونچا قد وجیہہ صورت، سفید غرارہ دار پاجامہ۔ سفید انگرکھا۔ دو پلڑی ٹوپی۔[2]"

"یہ ہیں قاضی نجم الدین برؔق۔ والد کا نام قاضی سراج الدین ہے۔ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد عہد قدیم سے اس قصبہ کے قاضی ہیں اور یہی سبب ہے کہ یہ خاندان عہدۂ قضا پر مامور ہونے کے باعث بستی میں معزز اور ذی علم خیال کیا جاتا ہے۔ اور لطف یہ کہ وہ باپ اور ماں دونوں طرف سے قاضی ہیں"۔ چنانچہ ان کی ننھیال والے بلند شہر کے قاضی تھے۔ شروع ہی میں دہلی چلے آئے تھے۔ بچپن اور جوانی کے ایام سرزمین دہلی میں گزارے اور یہیں مومنؔ خاں کی صحبتیں میسّر ہوئیں اور ان کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد مومنؔ خاں کے ایما پر اپنا کلام میر حسن تسکین کو دکھانے لگے۔

---

[1] خمخانہ جاوید ص ۱۱۶۔ جلوہ خضر ص ۲۴۴۔ سخن شعرا ص ۵۸، بزم سخن ص ۹۔ طور کلیم ص ۸۔ گلستان سخن ص ۱۲۸

[2] یادگار مشاعرہ فرحت اللہ ص ۸۳ (طبقات الشعرا میں کریم الدین نے بھی یہی بیان کیا ہے۔)

پیر میخانہ ہے تسکین برق اس کا جرعہ کش
ہے مزا اس کے سخن میں بادۂ انگور کا

شروع میں الہ آباد اور آگرہ کی عدالتوں میں امین رہے۔ پنشن پانے کے بعد مراد آباد میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور زندگی کے آخر ایام تک وہیں رہے اور سنہ ۱۸۹۹ء میں ۷۲ برس کی عمر میں دنیا سے انتقال کیا۔ چوں کہ طبیعت میں بے پروائی اور بے نیازی تھی اس لیے نہ کبھی دیوان یکجا کرنے کا خیال آیا اور نہ کبھی اس کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ بیشتر حصہ تلف ہوگیا۔ اب جو کچھ باقی ہے وہ متفرق اشعار میں ہے۔ ان کے کلام کا ایک طویل حصہ خمخانۂ جاوید میں ملتا ہے ورنہ دوسری جگہ دو چار شعر دستیاب ہوتے ہیں۔

برقؔ کا کلام ان کے ابتدائی دور میں دہلی میں ہر شخص کی زبان پر تھا۔ تخلص کے اعتبار سے کلام میں بھی برق کی سی شوخی تھی۔ اشعار پڑھ کر معلوم ہوتا تھا گویا آسمان سے لاکر بجلیاں بھر دیں اور پڑھنے کا انداز وہ دلکش کہ محفل پر چھا جاتے تھے۔ ان کے کلام میں ترنم، شوخی، دل کشی۔ غرض ہر وہ شے تھی جو دل کو اپنی طرف متوجہ کرلے۔ کلام میں ایک قسم کی نغمگی تھی۔ خمخانۂ جاوید کا بیان ہے۔

"غدر سے بیشتر آپ کا عین شباب کا عالم تھا مگر خداداد ذہانت اور زور طبع کی بدولت اس زمانہ میں بھی آپ کا کلام دہلی میں زبان زد خاص و عام ہوگیا تھا اکثر ارباب نشاط آپ ہی کے کلام رنگین سے رقص و سرود کی مجالس گرم کرتی تھیں[1]۔"

کلام میں اُن کا اپنا مخصوص رنگ ہے۔ کہیں کہیں مومنؔ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں بلاکی دلآویزی اور دل پر اثر کرنے والی کیفیت ملتی ہے۔ جس مشاعرہ میں یہ ہوتے ارباب کمال کی نظریں ان ہی پر پڑتیں۔ مضامین کی عمدگی بندشوں کی نفاست اور ترکیبوں کی لطافت نے مخالفوں سے بھی اعترافِ عظمت کرالیا۔ چنانچہ مصنف "گلستاں بے خزاں" (قطب الدین باطنؔ)

---

[1] خمخانۂ جاوید ص ۵۶۳

بھی جنھوں نے مومن اور شاگردانِ مومن کا ذکر حقارت سے کیا ہے۔ برق کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں۔

"برق کلام، کلام برق۔ مصرعہ ہے کہ شمشیر برق۔ برق کیا برق میں اور اس میں سراسر فرق۔ شعر پڑھا کہ بجلی چمک گئی۔ رعد کے دل میں جس کی دھڑک گئی۔ صفتِ ابرو میں جو مصرعہ ہوا گلوے عشاق کو تیغ قضا ہوا۔"[1]

اشعار ذیل سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے:-

——— رشک عدو و حسرت وصل آرزوئے مرگ
صدمہ ہے کونسا جو مری جان پر نہیں

——— حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے
ورنہ تو پردہ اٹھادے تو تو ہی تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندہ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

——— آج ارمان مرے دیدۂ تر کا نکلا
کہ ہر اک اشک لیے لخت جگر کا نکلا
ہم تو کہتے تھے کہ جنت میں لگے کا کیا جی
بارے کچھ اس میں بھی نقشہ ترے گھر کا نکلا
خط پہ خط بھیجے اسے لیکن یہ حسرت ہی رہی
کوئی قاصد نہ کبھی آن ادھر کا نکلا
عمر تو ساری کٹی کسب کمالات میں برق
یاں نہ پرساں ہی کوئی اہل ہنر کا نکلا

——— پوچھا جو اس نے آپ ہمیں چاہتے ہیں کیا
بے ساختہ زباں سے مری ہاں نکل گیا

---

[1] گلستاں بے خزاں ص ۴۹

——— کس واسطے خوش آئی تجھے دل کی خرابی
اے خانہ برانداز یہ تیرا ہی تو گھر ہے

——— واں جا کے چھپا کوئی جہاں جانے نہ پائے
اے برق یہ نالوں سے ترے غیر کو ڈر تھا

——— اب نہیں تاب تحمل تو اٹھا رخ سے نقاب
اک فسانہ ہو گیا عالم میں جلوہ طور کا

پیر میخانہ ہے تسکین برق اس کا جرعہ کش
ہے مزا اس کے سخن میں بادۂ انگور کا

کوئے جاناں سے نکلتے ہی یہ حالت ہو گئی
جس طرح ہارا تھکا آئے مسافر دور کا

——— بہت ہے مے کا قطرہ بھی جو دے ساقی محبت سے
غنیمت ہے جو گزرے کوئی دم غفلت میں حرمت سے[1]

بیتاب ——— نواب عباس علی خاں۔ ولادت ۱۸۰۹ء / ۱۲۲۴ھ وفات ۱۸۸۳ء / ۱۳۰۱ھ
بیتاب کا تعلق رام پور کے حکمراں خاندان سے ہے۔ ان کا شجرہ یہ ہے:۔

نواب فیض اللہ خاں
↓
نواب غلام محمد خاں
↓
نواب عبدالرحمٰن خاں۔ نواب محمد سعید خاں، نواب عبداللہ خاں ظریف
↓
نواب عبدالوہاب سروش۔ نواب یوسف علی خاں ناظم۔ نواب اصغر علی خاں اصغر

---

[1] دو نایاب بیاضیں ص ۱۰۴۔ خمخانہ جاوید حصہ اول ص ۵۶۲۔ جلوہ خضر ص ۲۴۴۔ طبقات الشعرا ص ۲۲۹ بیاض سخن۔ یادگار مشاعرہ ص ۸۳۔ گلستان سخن ص ۱۵۰۔ سخن شعرا ص ۶۴۔ بزم سخن ص ۲۱۔ گلستاں بے خزاں ص ۴۹۔

خورشید	خورشید احمد	غمگین	میر عبداللہ
راحت	مرزا محمود بیگ	غربت	ہدایت علی خاں
راسخ	سعادت علی خاں	غریب	غریب اللہ
سالک	قربان علی بیگ	غنی	عبدالغنی
سروش	عبدالوہاب خاں	قلق	مولا بخش
سکندر	سکندر خاں	قیصر	مرزا خدا بخش
سمجھو	منشی غلام محمد	کاظم	کاظم علی
شورش	غلام احمد	کرم	غلام ضامن
شہرت	میر نثار علی	مسکین	عبدالوحید
شیدا	میر جھبو خاں	مضطر	مرزا سنگین بیگ
شیفتہ	مصطفٰی خاں	ملال	محمد حسین زیدی
صاحب	امۃ الفاطمہ	موحد	حشمت علی خاں
صبر	اجودھیا پرشاد	ناظم	یوسف علی خاں
صفیر	میاں جان	نسیم	اصغر علی خاں
ظہور	ظہور علی صدیقی	وحشت	غلام علی خاں
عظمت	عظمت اللہ	وزیر	وزیر علی خاں
عنایت	عنایت علی خاں	یاس	حکیم خیر الدین

اشاریہ

نواب عبدالعلی خاں

نواب عباس علی خاں بیتاب۔ صاحبزادہ عنایت علی خاں عنایت

نواب ہدایت خاں غربت

امیر مینائی کے قول کے مطابق ان کا سال ولادت ۱۸۰۹ء ہے۔ ایک مدت دہلی میں رہنے کے بعد وہ لکھنؤ چلے گئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد حاکم صدر رامپور بنائے گئے اور وفات تک اس عہدہ پر وہ متمکن رہے۔ اپنے قیام دہلی کے زمانے میں مومن خاں سے اصلاح لیتے رہے۔ جب مومن کا انتقال ہوا تو عرصہ تک کسی سے مشورۂ سخن نہ کیا۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں جب غالب اپنے دوسرے سفر میں رامپور گئے تو بیتاب نے ان کے زانوئے تلمذ تہ کیا اور آخر تک غالب سے اصلاح لیتے رہے۔ ۶ جون سنہ ۱۸۸۳ء کو ظہر کے وقت انتقال کیا۔[1] ۷۴ برس کی عمر پائی۔ ان کا دیوان "گلدستہ جناں" کے نام سے ۱۳۰۱ھ میں مطبع حسینی رامپور سے چھپا تھا۔ مگر اب نایاب ہے۔ انھوں نے دو مثنویاں "گلزار عشق" اور "بہار عشق" لکھیں۔ جن کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ قلمی صورت میں کتب خانہ رامپور میں موجود ہیں۔ بیتاب کی صورت اور سیرت کے متعلق نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ تحریر کرتے ہیں:[2]

"جوانیست، نیکو منظر۔ زیبا شمائل، مہذب اخلاق۔ پاکیزہ سرشت ظاہرش چون باطن پیراستہ و باطنش چوں ظاہر ارستہ۔"

بیتاب معاملات حسن و عشق کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کے کلام میں واردات حسن و عشق کا بیان

---

[1] انتخاب یادگار امیر احمد ص ۷۶ مگر طبقات الشعرا کے قول کے مطابق سن پیدائش ۱۸۲۲ء ہونا چاہیئے کریم الدین لکھتے ہیں۔ "عمر ان کی ۱۸۴۷ء میں قریب ۲۵ برس کی ہوگی"، ص ۳۹۹

[2] تلامذہ غالب مالک رام ص ۵۰

[3] تلامذہ غالب مالک رام ص ۵۰

[4] گلشن بے خار ص ۳۴

جس خوبی سے ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے اور یہ خوبی ان میں مومؔن خاں کے تتبع سے آئی ان کا طرز ادا دلکش اور بندشیں نہایت چست ہوتی ہیں۔

——— بہلا گیا اپنے زلبس قتل کہ ایسا مجھ کو
بعد مردن بھی ہے مرنے کی تمنا مجھ کو

——— آخر فریب کھا کے کیا اس نے مجھ کو قتل
ہم نے کہا تھا تم سے اٹھائیں گے مر کے ہاتھ

——— داد سے روز جزا کی بھی رہوں گا محروم
یہ نظر آئے ہے طولِ شبِ ہجراں مجھ کو

——— معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ
ساقی اگر نہیں ہے نہ ہومے سے کام ہے

——— بیتاؔب دو دیئے ہیں تجھے بھی خدا نے ہاتھ
یہ خُم ہے یہ سُبو ہے یہ شیشہ یہ جام ہے

——— آج پیغام بر نہ کچھ کہنا !
ہیں وہ ہم پر بہت خفا بیٹھے
یہ بھی قدرت خدا کی اے بیتاؔب
تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے

——— کیا کچھ کہے جاتے ہو وصل کی تدبیر بناؤ
آپ عقبٰے میں تو ناصح رہے کام آنے سے
مل گیا راہ میں بت خانہ بھلے سے زاہد
کعبہ کو جا ہی چکے تھے ترے بہکانے سے

——— بیتاب کا بھی رندو معلوم ہے پتہ کچھ
ہم اس کو دیکھتے تھے اکثر اس انجمن میں[1]

---

[1] انتخاب یادگار ص ۷۰۔ خمخانہ جاوید ص ۶۳۵۔ جلوہ خضر ص ۲۴۴۔ تلامذہ غالب صنہ۵ باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

تسکینؔ ـــــ میر حسین۔ ولادت ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ وفات ۱۸۵۲ء/۱۲۶۸ھ

مومنؔ کے مخصوص ترین شاگردوں میں میر حسین تسکینؔ کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ دلّی کے سپاہی زادہ تھے والد کا نام میر حسین تھا مگر وہ میرن صاحب کے نام سے مشہور تھے ان کا سلسلہ میر حیدر قاتل وزیر فرخ سیر تک پہنچتا ہے۔ دلّی میں پیدا ہوئے اور سپاہی زادہ ہونے کے باوجود طبیعت "شمشیر و سنان" کی بجائے "طاؤس رباب" کی طرف مائل ہوئی۔ شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی اور اس فن میں وہ ملکہ بہم پہونچایا کہ مومن خاں اپنے جب کسی شاگرد کو مشورہ سخن کے لیے فرماتے تو کہتے میر حسین تسکینؔ کے پاس جاؤ ابتدا میں مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں وہ اپنا فارسی کلام صہبائی کو اور اُردو کلام شاہ نصیر کو دکھانے لگے۔ اس کے بعد جب مومنؔ خاں سے تلمذ ہوا تو پھر آخر عمر تک اس آستانہ سے جدا نہ ہوئے انھوں نے مومنؔ خاں کے دیوان کو یکجا کرنا شروع کیا جس کو بعد میں مکمل صورت میں ان کے صاحبزادے آہیؔ نے مرتب کیا۔[1] مومن خاں کے شاگردوں میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ مومنؔ نے اُن کے صاحبزادے عبدالرحمٰن آہیؔ کو اپنی فرزندی میں لے لیا۔

تسکینؔ نے جب دہلی میں معاش کی صورت نہ دیکھی تو لکھنؤ اور اس کے بعد میرٹھ گئے۔ جب دونوں جگہ کامیابی نہ ہوئی تو رامپور سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں تک ۱۲۶۸ھ میں وہیں وفات پائی۔ اتفاق دیکھئے کہ جس سال استاد کا انتقال ہوتا ہے اسی سال تسکینؔ بھی اپنی جان جان آفریں کو سپرد کرتے ہیں۔

قربان علی بیگ سالکؔ نے تاریخ کہی ہے۔

(بقیہ حاشیہ) طبقات الشعرائے ہند ص ۳۹۸۔ بزم سخن ص ۲۴۔ یادگار مشاعرہ ص ۸۵۔ گلشن بیخار ص ۳۴۔ طور کلیم ص ۱۹۔ گلستاں بے خزاں ص ۴۰۔ سخن شعرا ص ۷۲۔ گلستان سخن ص ۱۵۹۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی)، خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۱۲۲۔۔

[1] محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ شاہ نصیر کا دیوان بھی تسکینؔ نے مرتب کیا۔ مگر خمخانہ جاوید کی تحقیق یہ ہے کہ شاہ نصیر کے شاگرد منشی مہاراج سنگھ بہادر نے ترتیب دیا۔ ص ۵۹

برس دن میں مرے یہ تین شاعر
کہ جو تھے حضرت دہلی کے ساکن
نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخ رحلت
رہی فکر اس کی سالک کو بہت دن
کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب
ارم میں عارف و تسکین و مومن

نواب احمد علی خاں کے مقبرے کے قریب مدفون ہوئے۔[1]

عمر صرف پچاس برس کی پائی۔ عمر میں مومن خاں سے تین برس چھوٹے تھے۔ مومن کے رنگ اور شخصیت کو جس نے خاص طور سے اپنایا وہ تسکین۔ اگر دونوں کے کلام کو ملا دیا جائے تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوگا کہ کون سا کلام کس کا ہے۔ انداز بیان میں دل کشی اور خیالات میں شوخی ہے۔ شیفتہ لکھتے ہیں۔

"صاحب فکر بلند و اسلوب گفتارش دل پسند از حضرت مومن خاں بدرستی اشعار پرداختہ از احباب راقم است۔"[2]

یوں تو تسکین کے کلام میں رنگا رنگ کے مضامین ہیں مگر ان کا طرز عاشقانہ شاعری کی جان ہے۔ زبان کی صفائی و شیرینی اور بندشوں کی چستی نے ان کو ہم عصر شعرا پر ممتاز کر دیا ہے۔ استاد سے ان کو ورثہ میں معاملہ بندی اور شوخی ملی۔ مگر اس معاملہ بندی اور شوخی کے باجود انھوں نے روزمرہ سادگی اور صفائی کا سلیقہ بھی خوب بہم پہنچایا۔

پیر میخانہ ہے تسکین، برق اس کا جرعہ کش
ہے مزہ اس کے سخن میں بادۂ انگور کا

---

[1] انتخاب یادگار ص ۹۰

[2] گلشن بیخار ص ۴۲

لطف یہ ہے کہ تسکینؔ جہاں مضامین کی ندرت اور نازک خیالی کا اہتمام کرتے ہیں، وہاں زبان اور بیان کی طرف سے مومن کی طرح سے بے پرواہ اور بے گانہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جہاں تسکینؔ کے یہاں وہ محاسن نظر آتے ہیں جو مومن کی شاعری میں بدرجہ اتم ہیں وہ کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں جو مومن کی شاعری پر بدنما داغ ہیں۔

تسکینؔ کا مجموعہ کلام نایاب ہے۔ ایک مختصر سا کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔ یہ مخطوطہ ۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط صاف اور پاکیزہ ہے۔ اس میں صرف غزلیں ہیں۔ لیکن سب مکمل نہیں ہیں۔ بعض میں صرف دو شعر ہیں۔ آخر میں دو شعر کا ہجو یہ قطعہ غلام جیلانی آبؔدار کی ہجو میں ہے قطعہ محض نام دیدیا ہے ورنہ صرف دو شعر ہیں۔ تسکینؔ کا انداز یہ ہے:

—— تھا میری طرح غیر کو بھی دعوے الفت
ناصح تو اسے دینے کو الزام نہ آیا،
تسکینؔ کروں کیا دل مضطر کا علاج اب
کم بخت کو مر کر بھی تو آرام نہ آیا

—— یہ کہہ کے شبِ ہجراں کرتا ہوں تسلّی
جو رنج و مصیبت ہے سو انساں کے لیے ہے

—— ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

—— اے چشم سرمگیں تری گردش نے کیا کیا
راحت پذیر تھے ستم آسمان سے ہم

—— ہر صبح وہ ڈھونڈے ہے کوئی تازہ خریدار
صورت مری ہر روز بدل جائے تو اچھا

—— کہتے ہیں رنجش ظاہر میں مزا آتا ہے[1]
یونہی تم مجھ سے ذرا ہو کے خفا مل جانا

---

[1] ان اشعار میں مومن کی صاف آواز سنائی دے رہی ہے۔

——— ہزاروں مرگئے دیکھا جو عالم سوگ میں اس کا
لباس آیا تھا وہ کافر پہن کر میرے ماتم کا

——— ساکنان نہ فلک پر دیکھئے کیسی بنے
نالۂ سوزاں کا ہے اب کے ارادہ دور کا

——— میں نے رکھا جو پاؤں پر سر کو
بولے وہ ناز سے کہ بس سر کو

——— دل دینے کی قتل ہی سزا ہو
قائل ہیں تمہاری منصفی کے

کیا تجھ سا دکھا دیا ہے بدخو
کیوں ٹکڑے کیے ہیں آرسی کے

——— اب یہ حالت ہے کہ ان سا بیدرد
میرے بچنے کی دعا مانگے ہے

——— جاں ٹھہری نہ اس ابروے خم دار کے آگے
سچ ہے نہیں تھمتا کوئی تلوار کے آگے

——— تجھے جن سے گمان دوستی کے
دشمن ہوئے وہ ہمارے جی کے

ایک خلق ہے تلخ کام سن کر
کیا شور ہیں اپنی بے کسی کے[1]

---

[1] بہار بے خزاں (قلمی) ص ۶۲۔ آزاد لائبریری علی گڑھ۔ گلستان بیخزاں ص ۵۵۔ انتخاب یادگار ص ۹۔ تمنا جاوید ص ۵۹۔ گلشن بیخار ص ۴۲۔ طور کلیم ص ۲۱۔ گل رعنا ص ۳۲۲۔ طبقات الشعرائے ہند ص ۳۶۱۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا قلمی ص ۱۳۲۰۔ سخن شعرا ص ۸۵۔ یادگار مشاعرہ ص ۷۲۔ بزم سخن ص ۲۹۔ گلستان سخن ۱۷۰۔ طور کلیم ۲۱

[2] ان اشعار میں مومن کی صاف آواز سنائی دے رہی ہے

تسکین ـــــ مرزا مظفر بیگ

ان کا ذکر کسی تذکرے میں نظر نہیں آیا۔ خمخانہ جاوید نے اس قدر لکھا ہے کہ شاید میر حسین اور مظفر بیگ ایک ہی شخصیت ہیں۔

خمخانہ جاوید نے جو نمونہ کلام دیا ہے وہ پیش ہے۔

سر پر چڑھائے یا کہ ہم کو مار کے
بندے ہیں بال باندھے ہوئے زلف یار کے
افسوس پر نکلتے ہی کنج قفس ملا
دیکھے نہ دن خزاں کے نہ ہم نے بہار کے
بے خود شب وصال تو گریاں بروز ہجر
یکساں ہیں دن خزاں کے ہمیں اور بہار کے
اتنا تو مانیو مرا یاد صبا کہا
خاکے اُڑائیو نہ ہماری غبار کے
برباد یاں نہ اپنی پس مرگ بھی گئیں
بن کے بگولے پھرتے ہیں میری غبار کے

مظفر[1] بیگ تسکین دہلوی شاگرد مومن دہلوی کے نام سے گلدستہ بہار سخن بابت ماہ ستمبر، اکتوبر ۱۸۸۸ء میں دو غزلیں طبع ہوئی ہیں۔

یہ گلدستہ کسی ذخیرہ سے ملا ہے۔ اس کا سرورق نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ معلوم نہیں کہ اس کا ایڈیٹر کون تھا اور یہ رسالہ کہاں سے نکلتا تھا

جو دام زلفِ یار میں دل کو پھنسا چکے
تاحشر اس بلا سے رہائی وہ پا چکے

---

[1] یہ معلومات اور غزلیں حضرت تمکین کاظمی مرحوم سے دستیاب ہوئیں۔ صاحب خم خانۂ جاوید کا خیال ہے کہ یہ تسکین الگ نہیں تھے۔ نام میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میر حسین تسکین ہی ہیں۔

فرہاد و قیس اپنے ٹھکانوں پہ جا چکے
اک ہم رہے ہزار مصیبت اُٹھا چکے
کیا خاک ہاتھ آئے جیسا کہ سب رقیب
پہلے ہی میری خاک کا خاکہ اُڑا چکے
آئینہ رکھ کے بوسے لیے ان کے دو رسے
ہم ہجر میں بھی وصل کی لذت اُٹھا چکے
تسکین بہاؤ اشک نہ سوز جگر پہ تم
وہ آگ کیوں بجھاؤ جو خود ہی لگا چکے

اپنی اپنی ہے ترے دور میں قسمت ساقی
مے کا قطرہ بھی ہمارے لیے ساغر میں نہیں
چل دیئے آگ لگا جسم و جگر میں غم کی
گھر پڑا جلتا ہے اور حضرت دل گھر میں نہیں
جائیں جنت میں مسلمان سقر میں کافر
ہم سے رندوں کا ٹھکانا کہیں محشر میں نہیں
عمر تو صرف ہوئی عشق میں رو رو تسکین
دل لگانا ہی سزا اور مقدر میں نہیں[1]

تہوّر

مرزا غلام فخرالدین — وفات ۱۸۴۷ء / ۱۲۶۴ھ

یہ مومن کے پرگو تلامذہ میں سے ہیں۔ مصنف خمخانہ جاوید کے قول کے مطابق غدر سے دس سال قبل عین عنفوان شباب میں انتقال کیا[2]۔ یہ شہزادہ صابر کے بھائی تھے۔ ان کا دیوان غدر کے ہنگامے میں تلف ہو گیا۔ حافظ عبدالرحمٰن احسان اور مومن خاں کو کلام دکھایا ہے۔ رنگ کلام

---

[1] خمخانہ جاوید ص ۶۴ ۔ [2] خمخانہ جاوید حصّہ دوم ص ۱۵۹

یہ ہے :-

——— سنتے ہی نام غیر تہوّر بھی ہے غضب
اس جنگ جو سے لڑنے کو تیار ہو گیا

——— ناصحا پند و نصیحت تو نہ کر محفل میں
کہ مرے ساتھ کوئی اور بھی رسوا ہو گا

——— اب ہے کیا باقی جو ہے کاوش تری دست جنوں
چاک دامن ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا

——— پھر خدا لائے اسے یاد بخیر
کیا تہوّر بے تکلّف یار تھا

——— رشک دشمن کا سبب عشق میں کیا ہے ناصح
امتحان کیجئے مشفق کہیں شیدا ہو کر

——— لے آئے ذرا خط کا جواب اس سے کسی ڈھب
افسوس کہ قاصد سے اب اتنا نہیں ہوتا[۱]

——— تجھ سے کیا شکوہ ہے جی میں یہی آتا ہے کہ میں
دل سے سمجھوں کہ تجھے اس نے بھلا کیا سمجھا

——— آیا نہ ترے گوہر دنداں کے مقابل
شہرہ ہی سنا کرتے تھے ہم دُرِّ عدن کا

——— گر تہور کو نہیں شوق شہادت قاتل
کیوں ترے آگے جھکائے ہوئے گردن آیا

ثروت ——— محمد بخش

محمد بخش ولد احمد بخش۔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ ان کا ذکر

---

[۱] خمخانہ جاوید ص ۱۵۹۔ جلوہ خضر ۲۴۴۔ سخن شعرا ص ۹۴۔ بزم سخن ۳۲۔ گلستاں سخن ۱۷۹

جلوہ خضر اور سخن شعر میں ملتا ہے ورنہ عام طور سے تذکرے ان کے بارے میں خاموش ہیں ان کا صرف ایک شعر دستیاب ہوا۔

بھولی صورت پہ نہ جا ثروت بتان ہند کی
نرم گو ہر ظاہر میں ہیں لیکن دل ان کا سنگ ہے[1]

خورشید ـــــ خورشید احمدؒ

خورشید احمد نام تھا اور شاہ شکور احمد کے بیٹے تھے اور ان کا سلسلہ نسب حضرت مجدد الف ثانی سرہندی تک پہنچتا ہے۔

خورشید کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی[2] لیکن طبیعت میں سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا اس لئے خراسان اور ماوراالنہر۔ فرغانہ، سمرقند و فارس و بخارا

---

[1] جلوہ خضر ص ۲۴۴۔ سخن شعرا ص ۹۸۔ گلستان سخن ص ۱۸۲

[2] خورشید کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں دلچسپ غلط فہمی ہے۔ امیر مینائی کا بیان ہے کہ یادگار انتخاب (۱۲۹۰ھ کی تالیف کے وقت ان کی عمر پچیس برس تھی۔ اس اعتبار سے تاریخ ولادت ۱۲۶۵ھ ہوتی ہے امیر کے اس بیان کو تسلیم کر کے مالک رام نے خورشید کی تاریخ ولادت کا تعین کر دیا۔ خورشید احمد دہلوی ثم لکھنوی شاہ شکور احمد کے بیٹے ۱۸۴۹ء مطابق ۱۲۶۵ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے" اگر خورشید کی عمر ۱۲۶۵ھ فرض کر لیں تو مومن کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف تین سال تھی۔ اس اعتبار سے شاگرد ہونا معلوم کلب علی فائق نے یادگار انتخاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس تالیف کے وقت خورشید کی عمر ۵۵ برس تھی۔ اس اعتبار سے سنہ ولادت ۱۲۳۵ھ ہونا چاہیئے، مگر یادگار انتخاب میں خورشید کی عمر پچپن برس نہیں بلکہ پچیس برس تحریر ہے۔

(ملاحظہ ہو یادگار انتخاب تلامذۂ غالب مومن از فائق ص ۱۴۷

[3] خم خانۂ جاوید کا بیان ہے کہ خورشید کی پیدائش دہلی میں ہوئی (ص ۶۸) مگر تلامذۂ غالب ۱۰۳ سخن شعرا ص ۵۵ کا بیان ہے کہ ان کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔

حرفِ آغاز

اُردو شاعری میں اُستادی اور شاگردی کے رِشتے کو ابتدا ہی سے ایک باقاعدہ ادارے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی میں جوں جوں مغربی تعلیم اور خاص طور پر مغربی طرز کی تنقید کا رواج عام ہوتا گیا۔ اُستادی شاگردی کے رِشتے کی یہ قدیم روایت بھی آہستہ آہستہ اپنی قدر کھوتی چلی گئی۔ استادی اور شاگردی کے رشتے سے جہاں اُردو شاعری کے تعلق سے مذاقِ سخن کی تربیت اور ترویج میں بے پناہ مدد ملی، وہیں اس کے کچھ نقصانات بھی ہوئے۔

فائدہ تو یہ ہوا کہ تجربے کار اُستادوں کے ذریعے شاگردوں کو لسانی، فنی اعتبار سے اعلا تعلیم اور تربیت کے مواقع حاصل ہوئے جس سے مختلف سطحوں کے شاگرد اپنی اپنی استعداد کے مطابق فیض یاب ہوئے۔ اصلاحِ سخن کے عام طور پر تین مدارج ہوتے تھے۔ اوّل: زبان، محاورے اور روزمرّہ بیان میں امتیاز برتنے کا شعور اور ان کے استعمال کی صلاحیت؛ اس میں استاد اپنے شاگرد کو فصاحت اور بلاغت کے رموز بھی سمجھاتا تھا ــــ دوسرے موزوں شعر کہنے کی تربیت، جہاں فطری طور پر موزوں طبع شاگرد جلدی چل نکلتا تھا، وہاں دوسرے قسم کے شاگردوں کی طبع کو موزونیت پر لانے کے لیے اُستاد کو خاص محنت کرنی پڑتی تھی۔ ان ابتدائی دو مدارج میں استاد شاگرد کو عروض کے بکھیڑوں میں اُلجھا کر اس کے شعر گوئی کے ذوق کو مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے: اُستاد اپنے شاگردوں کو شعر میں

بلخ کی خوب سیر کی[1] اس زمانے میں جب کہ آمد و رفت کی اس قدر آسانیاں نہ تھیں۔ ان کا یہ اقدام لائق ستائش ہے۔ آخر میں دہلی آکر رہ بسے۔ خورشید نے اپنے چچا زاد بھائی شاہ رؤف احمد رافت سے بیعت کی تھی۔ نساخ کا بیان ہے کہ ابتدا میں اپنے چچا زاد بھائی رؤف احمد رافت سے اصلاح لی۔ ان کے بعد مومن و غالب کے شاگرد ہوئے۔

خورشید نے اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہے ہیں۔ اپنے رنگ میں خوب کہے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان ان اشعار میں مل جائے گا۔

نوید وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے خورشید
کسی طرح کوئی تسکین اضطراب تو دے

کہاں پہلو میں دل خورشید جس کو ہم تسلی دیں
جو کچھ تھا آنسوؤں کے ساتھ خوں ہو کر نکل آیا

جاتا نہیں آنکھوں سے تصور کبھی خورشید
موجود ہے ہر وقت وہ گویا مرے آگے

——— بتوں کے عشق سے باز آئے ہیں نہیں خورشید
ملا ہے تم کو محبت میں کیا مزا کہیئے

——— پھاڑنے کو اور کیا باقی رہا دست جنوں
چاک دامن ہو گیا پرزے گریباں ہو گیا

——— ——— خواب و خیال میں اسے آنا محال ہے
نازک ہیں اس قدر مرے نازک بدن کے پاؤں[2]

---

[1] خم خانۂ جاوید حصہ سوم ص ۶۷۔

[2] خم خانۂ جاوید ص ۶۷۔ جلوہ خضر ص ۲۴۴۔ تلامذہ غالب ص ۱۰۳۔ انتخاب یادگار ۱۲۶۔ سخن شعرا ص ۱۵۴۔ گلستان سخن ص ۲۱۲

راحت ـــــ مرزا محمود بیگ

ان کے والد کا نام مرزا احمد بیگ تھا۔ آبا و اجداد اپنے وطن روم سے ترک سکونت کر کے ہندوستان آئے اور دہلی کو وطن بنایا۔ مرزا محمود بیگ راحت سپاہی پیشہ تھے مگر غدر سے کچھ عرصہ قبل فوجی ملازمت کو ترک کر کے خانہ نشین ہو گئے۔ تذکرہ طور کلیم میں لکھا ہے۔

"مرزا محمود بیگ پور احمد بیگ رومی الاصل۔ دہلوی مسکن از تلامذہ مومن خاں۔ سپاہ گری از وسیلہ معاش او بود۔ در عاقبت گوشہ آں زو پذیرفت [1]"

راحت نے نتائج المعانی میں اپنے آپ کو مکند پور علاقہ ریوا کا عامل لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اکبر شاہ ثانی کی وفات کے بعد دہلی سے بھوپال چلے گئے تھے اور وہاں نواب جہاں گیر محمد خاں کی مصاحبت میں داخل ہو گئے۔ نواب کے ساتھ آشفتہ کی جنگ میں بھی شرکت کی۔ نواب سے ان کی وابستگی کا یہ حال تھا کہ نواب کی وفات تک ان سے الگ نہ ہوئے۔ نواب کی وفات کے بعد پھر دہلی واپس آ گئے [2]"

غدر کے انقلاب نے جہاں دوسروں کو آوارہ وطن کر دیا وہاں گوہر نوشاہی کا خیال ہے کہ ان کا دہلی سے ہجرت کا زمانہ ۱۸۶۰ء کے بعد کا ہے۔ کیوں کہ اس سے قبل وہ دہلی کے اس ادبی معرکے میں موجود ہیں جب راحت نے امین الدین کی تصنیف "قاطع القاطع" کی تائید میں اور غالب کی تصنیف قاطع برہان کے رد میں ایک خمسہ تحریر کیا تھا [3]

راحت دہلی سے ہجرت کر کے پٹیالہ چلے گئے۔ مگر یہ زمانہ کافی پریشانی؛ مالی بدحالی کا گذرا۔ ان کو وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں جن کی ان کو امید تھی۔

کدام مردہ دلی؟ راحتِ غریب و نحیف
کہ او بگوشۂ عزلت نشستہ بے خور و خواب

---

[1] تذکرہ طور کلیم ص ۴۴

[2] تحقیقی زاویئے۔ گوہر نوشاہی ص ۵۲

[3] " " " ص ۵۳

راحت کی وفات کے سلسلہ میں مجھے کوئی ایسی سند نہیں ملی جس سے قطعیت کے ساتھ کچھ کہا جاسکے۔ گوہر نوشاہی نے کلب علی فائق کے بیان کو قرین قیاس مانا ہے کہ ۱۸۸۱ء میں "تذکرہ طور کلیم" کی تالیف سے قبل انتقال ہو گیا تھا۔

انشائے مومن میں ایک محمود کا ذکر ہے جو غالباً یہی مرزا محمود بیگ راحت ہیں۔ ان کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ ہے

"بگوش محمود تقلید سگالیکہ تازہ تلمیذ فقیر است "ومن احبی سنتی قدامیت بعدی"

باید رساند" تقریظے کہ بر گلشن بیخار یعنی سفینہ کہ تازہ نغمہ بے کلک نواب ثریا جناب

محمد مصطفٰے خاں بہادر است، نگاشتہ ام نقل آں بخط نامحمود محمود بذریعہ مشار الیہ

ارسال گرامی انجمن داشتہ ام[1]"

فن شعر اور فوج کی ملازمت میں ایک قسم کا تضاد ہے مگر راحت نے اس تضاد کو دور کردیا۔ پھر تربیت کے لیے استاد ملا تو کامل۔

راحت کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے

۱۔ تذکرہ خزینۂ راحت۔

۲۔ مثنوی ہشت عدل۔

۳۔ نتائج المعانی۔

۴۔ واسوخت۔

خزینۂ راحت دستیاب نہیں ہوئی۔ اس کا سراغ مصنف کی تصنیف نتائج المعانی کے دیباچہ سے پتہ ملتا ہے۔

"مثنوی ہشت عدل" ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں عدل و انصاف کے موضوع پر آٹھ واقعات کو مختلف نظموں میں پیش کیا ہے۔

"نتائج المعانی" میں اڑسٹھ حکایات ہیں۔ گوہر نوشاہی کا بیان ہے کہ ان میں انیس حکایات

---

[1] انشائے مومن۔ مکتوب بنام احسن اللہ خاں

ان کی اپنی زندگی سے وابستہ ہیں۔ یہاں گوہر نوشاہی نے ایک اہم نکتہ کی طرف متوجہ کیا ہے

"نتائج المعانی میں بیشتر حکایت تاریخ کے مشہور شخصیات سے متعلق ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ تاریخ کی مستند کتابوں سے ان واقعات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ راحت اپنی یادداشتیں قلم بند کر رہے تھے[1]۔"

واسوخت کا تذکرہ خم خانہ جاوید میں موجود ہے۔ صاحب خم خانۂ جاوید نے ان کی غزلیات کے دیوان کا بھی ذکر کیا ہے مگر تذکروں کے مختلف اشعار کے علاوہ اور کچھ دستیاب نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے "نتائج المعانی" اور "مثنوی ہشت عدل" ایڈٹ کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کر دی ہے۔

غزل کے اشعار جو تذکروں کی مدد سے یک جا کیے ہیں ان کا نمونہ یہ ہے۔ ان اشعار سے ان کے پاکیزہ اور شستہ ذوق کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

——— کچھ جان سے آتی ہے مری جان میں قاتل
پانی ترے خنجر میں ہے کیا آب بقا کا

——— کھلایا مجھے غم پلایا مجھے خوں
ہوا جب میں ناکام مہماں تمہارا

——— غیروں سے جو اشارے محفل میں ہیں تمہارے
سمجھیں وہ یا نہ سمجھیں پر یہ غلام سمجھا

——— اشک آنکھوں سے نکل کر زیر مژگاں تھم گیا
دم نہ سایہ میں کیوں کر تھا مسافر دور کا

——— ہم سے وہ بھی چھوٹے اور یہ دل شیدا چھوٹا
یاد کس کس کو کریں خیر جو چھوٹا چھوٹا

——— لے گیا رات کو باتوں میں لگا کر ان کو
کیوں کہ قائل نہ ہوں راحت تری تقریر کے ہم

---

[1] تحقیقی زاویے گوہر نوشاہی ص ۴۸

——— اجل پہلے آوے کہ وہ پہلے آویں
یہی راہ مدت سے ہم دیکھتے ہیں

——— روئے قاتل سے خجالت کیوں نہ ہو روز جزا
ساتھ میرے ایک عالم ہو لیا فریاد کو

——— آنکھیں بھر آئیں مہر سے اس رشک ماہ کی
قاتل تو ایک بوسہ مجھے دے کے قتل کر

سینہ پر رکھ کر ہاتھ جو اک میں نے آہ کی
لازم ہے کچھ تو دینی دیت بے گناہ کی

——— صبر و قرار تاب و تواں رفتہ رفتہ سب
آجائیں گے کہیں سے دل رفتہ گر ملا

——— یہ چاہتا ہوں کہ راز نہاں نہ افشا ہو
ترے دہن سے زیادہ مرا دہن بن جائے[1]

دلچسپی کے لیے راحت کی واسوخت کا یہ بند ملاحظہ ہو[2]

——— اب یہ حالت ہے پڑے رہتے ہیں دن رات اداس
اڑ گئے طائر وحشی کی طرح ہوش و حواس

جز غم و رنج نہیں آ کے پھٹکتا کوئی پاس
مونس و محرم و غم خوار ہے اک عالم یاس

——— جائے سینہ میں نہیں ہے کہ جہاں ہوئے نہ داغ
دل کی جا پہلو میں جلتا ہے مرے ایک چراغ

مثنوی کا یہ بند قابلِ غور ہے۔ 'تو' اشارہ اپنی طرف ہے اور 'یہ' کا راجہ مہندر سنگھ

---

[1] مخزانہ جاوید ص ۳۰۷۔ جلوہ خضر ۲۴۴۔ طور کلیم ص ۴۴۔ سخن شعرا ص ۱۷۵۔ بزم سخن ص ۵۳

[2] بحوالہ تحقیقی زاویئے گوہر نوشاہی

کی طرف[1]

——— تو ہے مریض اور یہ ہے مسیحا
مشکل کیا ہے؟ تیرے مداوا
مانا ہے ہم تو ہے پریشاں
رنج ہے تیرے گھر میں مہماں
——— ہے یہ اشارہ تیرا کافی
ہوجاوے گی اس کی تلافی

راحت نے غالب کی مخالفت میں جو خمسہ تحریر کیا ہے۔ اس سے تاریخ بھی برآمد ہوتی ہے۔[2]

مومن نماند آنکہ نشنابد بہ نیک و بد
صہبائی ہم بمرد کہ آید بزد و کد
میدان صاف صد فگن پنجۂ اسد
اما ندیدہ بود طرا زندہ فسد
شمشیر آب دارِ زبانِ امین دیں

۱۲۸۳ھ

راسخ ——— سعادت علی خاں

مومن خاں کے تلامذہ میں سے تھے دہلی کے تھے۔ بقول مؤلف خمخانہ جاوید "نیک طینت خلیق اور طباع نوجوان تھے اور غدر سے پہلے زندہ و سلامت تھے۔

یہ ان لوگوں میں سے تھے جو دنیا سے بے نام و نشان چلے گئے۔ نہ ان کی زندگی کے حالات ملتے ہیں نہ کلام۔ دو شعر تذکروں میں ملے ہیں جو نذر ہیں۔

——— میں بنائے جہاں سہی لیکن
جب کہ ناپائیدار ہوں کیا ہوں

---

[1] [2] بحوالہ تحقیقی زاویئے گوہر نوشاہی

ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر
سرمہ ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں[1]

سالکؔ ـــــ قربان علی بیگ ـــــ ولادت ۱۸۴۵ء / ۱۲۲۶ھ متوفی ۱۸۷۹ء / ۱۲۹۷ھ

مرزا قربان علی بیگ ۱۲۲۶ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا مولد دہلی بتایا ہے جو محل نظر ہے[2]

ان کا حلیہ دیکھنا ہو تو مرزا فرحت اللہ بیگ کی زبانی سُنئے:۔

"چھوٹا سا قد۔ دبلے پتلے ہاتھ پاؤں۔ موٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ موٹی جلد، گندمی رنگ، اس پر چیچک کے داغ۔ چھدری چھوٹی سی ڈاڑھی۔ کلوں پر کم، ٹھوڑی پر زیادہ۔ سر پر خشخاشی بال۔ بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں۔

لباس کا نقشہ بھی سن لیجئے۔

نیچی چولی کا انگرکھا۔ تنگ مہری کا پائجامہ۔ سر پر سفید گول ٹوپی۔ ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال۔"

قربان علی بیگ کے والد کا نام مرزا عالم بیگ تھا جو عاشق علی بیگ کے بیٹے تھے۔ حیدرآباد وطن ہونے کے باوجود قربان علی بیگ کی سکونت دہلی میں رہی اور زندگی کا بڑا حصّہ اس سرزمین پر گزرا۔ بچپن سے اسی شہر میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔ طبیعت شعر کی طرف مائل تھی اور پھر خوبئ قسمت یہ کہ ان کو مومنؔ و غالبؔ کی دلّی ملی۔ اس لیے ذوقِ سخن کو سہارا مل گیا۔ مومنؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور قربانؔ تخلّص اختیار کیا۔ مومنؔ کے

---

[1] مخزنہ جاوید ص ۳۳۴۔ بزم سخن ص ۵۳۔ سخن شعرا ۱۷۶۔ جلوہ خضر ص ۲۴۴۔ گلستان سخن ۲۳۷

[2] صاحب قاموس المشاہیر (حصّہ اوّل) نے ان کو دہلوی لکھا ہے۔ ص ۲۷۹۔ غالباً ان کے دہلوی لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ سالکؔ کے باپ دادا کا وطن دہلی تھا اور وہ تلاش روزگار میں حیدرآباد آئے تو سالکؔ کی پیدائش وہاں ہوئی اور پھر جب ان کے والد دہلی واپس آگئے تو سالکؔ کی نشوونما دہلی میں ہوئی۔ تلامذہ غالب ص ۱۴۰۔

انتقال کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے اور مرزا کے ایما سے سالک تخلص اختیار کیا۔ جب غدر کے ہنگامے شروع ہوئے تو دلّی کو چھوڑنا پڑا اور الور میں پناہ گزین ہوئے اور وہاں وکالت کرتے رہے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد وطن یاد آیا اور حیدرآباد کا رُخ کیا۔ حیدرآباد میں ایک رسالہ "مخزن الفوائد" کے نام سے نواب عماد الملک کی سرپرستی میں نکلتا تھا سالک کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ حیدرآباد سررشتوار کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ آخر ۱۲۹۷ھ میں وہیں انتقال کیا۔[1]

قدر بلگرامی نے تاریخ وفات لکھی :-

"نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مرد"

سالک کے دیوان "میخانہ سالک" اور "منجار سالک" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

سالک کو شطرنج کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ نواب علاء الدین خاں کے قائم کردہ "جلسہ شطرنج" دہلی کے وہ خاص رکن تھے۔

شعر سے ایک گونہ مناسبت تھی، ان کو مومن و غالب جیسے باکمال استاد ملے۔ جن کی توجہ دلی سے کچھ عرصہ میں اپنے معاصرین میں ممتاز ہو گئے۔ اگرچہ ان کے یہاں مومن کا رنگ بھی موجود ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ ان کے کلام میں پختگی اور گہرائی غالب کی شاگردی کے بعد پیدا ہوئی۔ مومن کی شاگردی کے وقت سالک کا محض تقلیدی دور تھا۔ سالک کے دیوان کو اٹھائیے نازک خیالی مضمون آفرینی فصاحت اور بلاغت اُن کے کلام کے قابل ذکر جوہر ہیں۔ ان کی خصوصیات کلام کے متعلق سریرام لکھتے ہیں :-

"نازک خیالی میں فرد۔ مضمون آفرینی میں بے نظیر تھے، فصاحت بلاغت کلام کا قابل داد جواہر ہے۔ بندش کی نفاست اور صفائی اپنے ساتھ سوز و گداز لیے ہوئے ہے۔ آپ حسن و عشق کے رموز بیان کرنے میں انسانی فطرت پر گہری نگاہ ڈالتے تھے۔ معاملہ نگاری میں عامیانہ روش سے بچتے تھے حضرت سالک مبالغہ کے دشوار گذار میدان میں بھی شوخ بیانی کو مدِّ نظر رکھتے تھے۔ طرز

---

[1] تلامذہ غالب مالک رام ص ۱۴۱

ادا سے شعر مزیدار ہو جاتا تھا۔ سچ تو یوں ہے کہ آپ کا کلام دلّی کی شاعری کا قابلِ قدر نمونہ ہے[۱]"

سالکؔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ انھیں جملہ اصنافِ سخن پر قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ دلّی کی تباہی پران کا "شہر آشوب"، اور استاد (غالبؔ) کی رحلت پران کا مرثیہ ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ سالکؔ نے غالبؔ اور مومنؔ دونوں رنگوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ اپنایا ہے۔ مومنؔ کی معاملہ بندی اور نازک خیالی۔ غالبؔ کی گہرائی اور گیرائی دونوں کا حسین امتزاج سالکؔ کے یہاں ملتا ہے۔ جس طرح تسکینؔ کو یہ فخر حاصل تھا کہ مومنؔ کے اکثر تلامذہ نے ان کی شاگردی اختیار کی، اسی طرح غالبؔ کے بہت سے شاگردوں نے سالکؔ کے زانوئے ادب تہ کیا۔ سالکؔ کا رنگِ شاعری یہ ہے۔

——— ایک میری ہی پریشانیٔ قسمت لکھ کر
تہہ کیا کاتبِ تقدیر نے دفتر اپنا

——— دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی
بے وفا تو بھی اسے لے کے پشیماں ہو گا

——— رہ گئیں دل میں حسرتیں سالکؔ
آ گئی عمر پارسائی کی،

——— اعتبارِ نگہہ ناز ہے کیا کیا ان کو
قتل کو آتے ہیں اور ہاتھ میں شمشیر نہیں

——— یوں عمر گزاری تری فرقت میں کہ ہر دم
جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقیں تھا

——— سالکؔ صنم کدہ سے نکالے گئے کہیں
حضرت ارادہ رکھتے ہیں کیوں خانقاہ کا

---

[۱] خمخانۂ جاوید ص ۳۸

——— سالک جو کوئی عشق میں مجھ کو برا کہے
تکتا ہوں منہ کو اور یہ کہتا ہوں "ہاں درست"

——— چُپ چاپ پڑے ہوئے تھے ابھی خانقاہ میں
کچھ کچھ کھلے ہیں بیعتِ پیرِ مغاں سے ہم

——— کب دیکھئے قفس سے رہائی نصیب ہو
کیا آمدِ بہار کی ہم آرزو کریں

——— ہم حشر میں چلے گئے بے خوف اس طرح
گویا یہ فتنہ اس کا اٹھایا ہوا نہ تھا

——— کہہ کر تمام سالکِ غم گیں کا ماجرا
میں نے کہا غلط ہے تو بولے کہ ہاں غلط

——— نقاب چہرے سے الٹو ذرا کہ میں کب تک
شکایتِ نگہِ نارسا کیے جاؤں

——— ہم سے بھی مل گیا روتا ہوا سالک ابھی
کیا ارادہ ہے خدا جانے کدھر جانے کو ہے[1]

سروش ——— عبدالوہاب خاں ——— ولادت ۱۸۲۲ء / ۱۲۳۸ھ

صاحبزادہ عبدالوہاب خاں المتخلص بہ سروش کا سلسلہ بھی خاندان حکمراں رام پور سے ملتا ہے۔ یہ صاحبزادہ عبدالرحمٰن خاں خلف نواب غلام محمد خاں کے فرزند تھے۔ سروش ۱۲۳۸ھ میں پیدا ہوئے۔[2] آدمی خلیق اور ملنسار تھے ابتدا میں مومن سے مشورہ سخن کیا۔ اس کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے اور غالب کے انتقال کے بعد خوش وقت علی خاں خورشید سے استفادہ کیا۔ ان

---

[1] خمخانہ جاوید ص ۳۷۰۔ تلامذہ غالب ص ۱۴۰۔ گل رعنا ص ۴۲۹۔ بزم سخن ص ۵۶۔ بیاض سخن ص یادگار مشاعرہ ص ۸۷۔ طور کلیم ص ۴۸۔ سخن شعرا ص ۲۰۳۔ گلستاں سخن ص ۲۶۰

[2] انتخاب یادگار کی تالیف کے وقت ان کی عمر ۵۲ برس تھی (انتخاب یادگار ص ۱۷۲)

معنی کی ادائیگی کا سلیقہ سکھاتا تھا۔ ہمارے عہد کے شاعر معنوی اعتبار سے تو شعر ٹھیک کہہ لیتے ہیں لیکن ایسے شاعروں کی تعداد کم نہیں، جنھیں زبان و بیان پر وہ قدرت نہیں جو ہونی چاہیے۔ ان میں ہمارے عہد کے کچھ نامور شاعر بھی شامل ہیں۔ در اصل زبان، فن اور معاملاتِ عروض پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف کتابیں ہی کافی نہیں اُن کے لیے اُستاد کی رہنمائی اور مشق بھی ضروری ہے۔ ہم ایسے شاعروں کو جانتے ہیں، جو بالکل اُمّی یا بہت کم پڑھے لکھے تھے لیکن چوں کہ انھوں نے اُستاد کی صحبت کا فیض اُٹھایا تھا اس لیے انھیں شعر کہنے کا سلیقہ آتا تھا اور بڑی بات یہ کہ وہ محاورے اور روزمرّہ کے استعمال یا الفاظ کے تلفّظ میں کبھی غلطی نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ اُستادی اور شاگردی کے اِس رشتے سے اُردو شاعری کو فائدے کے ساتھ ساتھ نقصان بھی پہنچا۔ نقصان یہ ہوا کہ یہ ادارہ بعض استادوں کے لیے مالی وسائل کا ذریعہ بن گیا۔ بڑے اُستادوں کے حلقۂ تلمذ میں عام شاعروں کے علاوہ بادشاہ، راجا، مہاراجا، نواب اور دولت مند لوگ ہوتے تھے، جو اُستاد کو باقاعدہ تنخواہ دیتے تھے یا پابندی سے ان کی مالی اعانت کرتے تھے۔ لیکن وہ اُستاد اِن فن جنھیں اعلا طبقے کی سرپرستی حاصل نہیں ہوتی تھی یا جو اپنے ادبی مرتبے کے اعتبار سے دوسرے درجے کے شاعر تھے۔ انھیں اپنی مالی ضرورتوں کے لیے ایسے لوگوں کو شعر کہہ کر دینے پڑتے تھے جن میں سے اکثر تو موزوں طبع بھی نہیں ہوتے تھے۔ بعض اساتذہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی غزلوں کی باقاعدہ قیمت ہوا کرتی تھی اور ایسے شاعر جو موزوں طبع نہیں ہوتے تھے یہ غزلیں خرید کر لے جاتے اور دُھوم دھام سے مشاعرے میں پڑھ کر داد لُوٹتے تھے۔ بعض شاعر غزلیں خرید کر اپنی گلے بازی کے بَل پر عوامی طرز کے مشاعرے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرتے تھے۔ آج کل کے مشاعروں میں ترنّم کی بہت اہمیت ہے۔ اِس لیے عام طور سے مشاعروں میں بہت اچھے ترنّم کے ساتھ جو خواتین اور شاعر اپنا کلام سناتے ہیں اُردو اور اُردو رسم الخط دونوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اُستاد انھیں قیمتاً ایسی غزلیں دیتا ہے، جو ان کی ترنّم کا ساتھ دیتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کہیں طرحی مشاعرہ ہوتا تو اُستاد ساٹھ ستّر شعر کہہ لیتا۔ ان میں سے پانچ چھ شعر منتخب کر کے اپنے لیے رکھ لیتا اور باقی کو پیسے لے کر شاگردوں میں تقسیم کر دیتا۔ استاد سائل دہلوی کے بارے میں کہا جاتا ہے

کا ذکر عام طور سے تذکروں میں نہیں ملتا، نمونہ کلام مختصر پیش ہے :-

——— تھامتا دل کو کہ آنکھوں کو نہ رونے دیتا
ایک میں جھگڑوں ہزاروں کہو کیا کیا کرتا

——— قتل عالم کو کیا ایک نظر میں تو نے
کون باقی ہے ستم گار جو پرساں ہوگا

——— سچ تو یہ ہے لاکھ سر مارا کرو ماتھا گھسو
کچھ کرو لکھا نہیں مٹتا کبھی تقدیر کا

——— شکل آئینہ جو خالق مجھے پیدا کرتا
وہ مجھے دیکھتے اور میں انھیں دیکھا کرتا

——— ہے بات بے کلی سے وہ اب ہاتھ دل پہ ہے
رہتی تھی جس میں ان کی کلائی تمام رات

——— سرکاؤ سر اپنا مرے زانو پہ نہ رکھو
سو بھی رہو جاکے وہیں جاگے ہو جہاں رات

——— بزم سے تو نے نہ اعدا کو نکالا ظالم !
یہ بھی شاید کہ ہمارا کوئی ارماں ہوگا !

——— اسی کے تار سے کرتا رفو تو میرے دامن کو
لگا رکھا جیب میں اے بخیہ گر ٹکڑا گریباں کا

——— یار مجھ کو ملا ہے ہرجائی،
کیوں نہ چرچا ہو جا بجا میرا

——— ہم کو جب دربان نے روکا درِ دلدار پر
دیکھو بیتابی تڑپ کر جا رہے دیوار پر

۱؎ انتخاب یادگار ص ۱۷۲۔ خمخانہ جاوید ص ۱۸۹۔ تلامذہ غالب ص ۱۵۲

سکندر ـــــ سکندر خاں

سکندر خاں نام تھا اور سکندر تخلص کرتے تھے۔ ان کے متعلق تفصیلی حالات نہیں ملتے۔ خمخانہ جاوید نے ان کو دہلوی لکھا ہے۔ مگر سخن شعرا میں نساخ نے ان کو شاہجہاں پور کا باشندہ بتایا ہے۔ یہ مومن کے تلامذہ میں سے تھے۔ قادر بخش صابر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مومن سے اس شعر کی اصلاح پر مباحثہ ہوا۔

دم لینے میں ہے مجھ کو تو آئینہ کا لحاظ
اور یار یہ سمجھتے ہیں مجھ میں ہی دم نہیں

بات بڑھ گئی چنانچہ سکندر نے ترک مشورہ کیا۔ گلستان سخن میں ان کے یہ شعر ملتے ہیں:۔

ـــــ ہوش کھوئے ترے نظارے نے ایسے کہ سحر
آئینہ اپنی بھی حیرانی پہ حیراں نہ ہوا

ـــــ کس کا نام اس کی زبان پر ہے کہ اس نفرتا پر
حرف ناصح سے دماغ اپنا پریشان نہ ہوا

ـــــ ہے وہ کیا قتل سکندر کہ تجمل ہو اس سے
جب کہ خونریزی اعدا سے پشیمان نہ ہوا[1]

سمجھو ـــــ منشی غلام محمد ـــــ متوفی ۱۸۵۵ء / ۱۲۷۲ھ

منشی غلام محمد نام تھا اور عرفیت میاں سمجھو تھی۔ اور یہی تخلص قرار پایا۔ سورت بندر کے رہنے والے تھے۔ مرزا جہاں خلف اکبر شاہ ثانی کے سفر حجاز کی واپسی پر سورت بندر سے دہلی آ گئے۔ یہاں سے حیدر آباد چلے گئے اور وہاں راجہ چندو لال کے دربار میں زمرہ شعرا میں داخل ہوئے اور پھر اپنے وطن واپس آ گئے۔

ان کی شاعری کے متعلق خمخانہ جاوید میں تحریر ہے۔

---

[1] خمخانہ جاوید ص ۲۲۲۔ سخن شعرا ص ـــــ گلستانِ سخن ص ۲۶۷

"کلام کا رنگ اچھا ہے۔ شعر کا رنگ بالکل نیا تھا۔ مضمون آفرینی میں طاق۔ خیال بندی میں شہرہ آفاق تھے"[1]

نمونہ کلام یہ ہے:

——— ویرانہ عالم کی ذرا خاک جو چھانی
ہر گرد میں اک لیلیٰ کا محمل نظر آیا

——— ذرا ماہتابی پہ آیا تو ہوتا
وہ مہتاب سا منہ دکھایا تو ہوتا

——— بد دعا غیر کو بھی میں تو نہ دوں گا تجھ کو
قید گیسو سے کہیں اس کے ہو آزاد رقیب

——— ابرو سے دل بچا تو مژہ سے جگر چھدا
رو کی ادھر کی چوٹ تو کھائی ادھر کی چوٹ

——— لکھا ہے قصہ سوز دروں میں ڈرتا ہوں
ہوائے بال کبوتر سے خط بھڑک نہ اٹھے

——— از بس دہان دلبر انگریز تنگ ہے
کیا نکلے منہ سے بات کہ قید فرنگ ہے

——— میں بھی سمجھ لوں جو مان بات اے پردہ نشین
ہاں بدلنا ہی اگر منظور یہ گھر ہے تجھے
جائے نظارہ بھی ہے، گوشہ بھی ہے، پردہ بھی ہے
آمری آنکھوں میں رہ یہ عین بہتر ہے تجھے

شورش ——— غلام احمد

غلام احمد شورش کے والد کا نام محمد اکبر تھا۔ اصل وطن کشمیر تھا۔ مگر پھر دہلی کو وطن

---

[1] خمخانۂ جاوید ص ۲۶۲

بنالیا۔ دہلی میں کتابت کرتے تھے[1]۔ جب معاش نے زیادہ پریشان کیا تو الور چلے گئے اور وہاں راجہ بنئے سنگھ والی الور کے یہاں ملازم ہوگئے۔ خمخانہ جاوید میں مذکور ہے کہ[2] مرض استسقا میں مبتلا ہوکر ۵۴ سال کی عمر میں اس خاکدان کو چھوڑ کر راہ گیر عالم بقا ہوئے[2]۔ مصطفےٰ خاں شیفتہ سے دلی محبت تھی۔ چنانچہ شیفتہ گلشن بیخار میں لکھتے ہیں:۔

"جوان شوریدہ مزاج است۔ گاہ گاہ بہ نظم اشعاری پردازواز مومن خاں استفادہ می سازدو باداعی طریق آشنائی می سپرد[2]"

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:۔

تا خواب میں بھی جلوہ فروزاں کے نہ ہو تو
ہم کوچۂ اغیار میں فریاد کریں گے

کیا جانے عدو خون جگر پینے کی لذت
شورش سے مزہ پوچھئے تلخ آب الم کا

کیا قیامت ہے کہ روز حشر ہے ہر روز ہجر
تھا قیامت کے لیے یارب مقرر ایک دن

ہمدم شب ہجراں میں اجل بھی تو نہیں ہے
حال اپنا کہیں کیا درو دیوار کے آگے

نامہ جو بنالایا ہے قاصد تو صنم کا
ایمان نہ کھونا کسی مایوس کرم کا

کھو رکھے گا مجھ کو میرا دیدہ تر ایک دن
شمع ساں گھل جائے گا یہ جسم لاغر ایک دن

جب وہ بے خواب غم دوری اغیار سے ہو
شکوہ پھر کیوں نہ مجھے طالع بیدار سے ہو

---

[1] طبقات الشعرا کریم الدین ص ۲۶۸ [2] گلشن بیخار ص ۱۱۳

چشم عاشق سے جو دریا کو کوئی دے تشبیہ
بس وہیں رونے کا ہو جائے بہانہ مجھ کو

ترجیع بند میں ان کا لکھا ہوا مرثیہ ہے:۔

عالم میں ایک شورِ قیامت بپا ہوا!
لو آسمان ٹوٹ پڑا ہائے کیا ہوا
ہر گھر سے کیوں ہے نالہ و احسرتا بلند
عشرت کدہ جہاں کا کیوں غم سرا ہوا
تھمتی نہیں ہے اشک مسلسل کی کیوں جھڑی
کیوں چشم خونفشاں ہے یہ کیا ماجرا ہوا
مرنے کے بعد رونے کی جن سے اُمید تھی
افسوس ہے کہ انھیں کا ہمیں بیٹنا ہوا
کیوں قطرہ ہائے اشک نہیں زیب آستیں
لختِ جگر ہے آنکھ میں شاید رکا ہوا[1]

شہرت ـــــ میر نثار علی وفات ۱۹۲۰ء / ۱۳۳۹ھ

میر نثار علی نام شہرت تخلص تھا۔ والد کا نام منشی حسین علی اور فرحت تخلص تھا اولاد میں امیر کلال پیرِ و مرشد امیر تیمور کے تھے اور دہلی میں سکونت رکھتے تھے۔ منشی حسین علی صاحبِ تصانیف تھے ان کی تصانیف میں ام التواریخ اور موجد التواریخ ہیں منشی صاحب بہادر شاہ ظفر شاہ دہلی کے داماد مرزا قمر طالع اور ان کی لڑکی کے استاد، اس وجہ سے شہرت کا آنا جانا بھی قلعہ معلیٰ میں رہتا تھا[2]

---

[1] خمخانہ جاوید ص ۴۷۔ جلوہ خضر ص ۲۴۴۔ طبقات الشعرائے ہند ص ۳۶۸۔ گلشن بیخار ص ۱۱۳۔ طور کلیم ص ۵۸۔ سخن شعرا ص ۲۵۴۔ خوش معرکہ زیبا (قلمی)، ص ۱۲۲۰۔

[2] عبیر ہندی از نثار علی شہرت دار الاشاعت لاہور مخزونہ دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی۔

میر نثار علی ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات ریاست جموں وکشمیر تھے۔ یہ خود مصنّف تھے۔ چنانچہ ان کی تصانیف میں عبیر ہندی اور مشک ہندی ہیں اول ذکر کتاب کا موضوع لغات واصطلاحات نسواں ہے۔ اس کتاب کے لکھنے کا سبب خود مصنف نے بیان کیا ہے۔

"میں پنجاب، بمبئی، مدراس میں دیکھتا ہوں کہ اردو زبان اچھی طرح استعمال نہیں کی جاتی اور عورتیں بہت کم اردو جانتی ہیں اور زنانہ زبان تو جانتی ہی نہیں جو دہلی کی شاہزادیوں اور امیرزادیوں کی زبان ہے، جس پر سے فصاحت وبلاغت تصدق رہتی ہے۔"

موخرالذکر کتاب راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری مگر عبیر ہندی کے اعلان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع بھی یہی ہے۔ اس اعلان کے الفاظ یہ ہیں

"اول جلد یہ عبیر ہندی اور دوسری جلد مشک ہندی ہے۔"[1]

شہرت کا ذکر عام طور سے تذکروں میں نہیں ملتا۔ ان کی مومن سے شاگردی کا حال بھی عبیر ہندی کے سرورق سے معلوم ہوا۔

"عالی جناب میر نثار علی صاحب شہرت فخر شعرائے ہند دہلوی شاگرد خلد آشیاں مومن خاں صاحب مومن دہلوی۔"[2]

اس کتاب کی تقریظ سے شہرت کے متعلق چند باتوں کا مزید پتہ چلتا ہے جن سے ان کی حیثیت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"یہ وہی نثار علی صاحب شہرت دہلوی ہیں جنھوں نے ۱۸۷۲ء میں قوم کو جگایا تھا کہ اگر ہماری زبانیں مٹ گئیں تو ہمارے مذہب بھی مٹ جاویں گے۔ صاحب ممدوح کی پارٹی نے گورنمنٹ کے حضور میں عرضی پیش کی تو پھر اورینٹل کالج بنا، جو عربی فارسی سنسکرت کو زندہ کر رہا ہے۔"[3]

---

[1] عبیر ہندی از نثار علی شہرت دارالاشاعت لاہور مخزونہ دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی۔

[2،3] عبیر ہندی از نثار علی شہرت دارالاشاعت لاہور مخزونہ دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی۔

ان کی تعلیمی سرگرمیاں کی مدح کرتے ہوئے منتظمہ دارالاشاعت نے مزید لکھا:۔

"یہ وہی میر نثار علی شہرت ہیں کہ جب جاپان ترقی کر رہا تھا تو انھوں نے اور ان کے دوستوں نے زور دیا کہ لاہور میں ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جو علوم وفنون مفیدہ کا ترجمہ دیسی زبانوں میں کرے۔ جس سے آنریبل سرسیّد سے پانچ برس تک بحث رہی اور آخر کار پنجاب یونیورسٹی کو اختیار ملے۔ یہ یونیورسٹی ملک کے روپے سے بنی ہے یہ وہی نثار علی صاحب شہرت ہیں کہ انھوں نے اور ان کے دوستوں نے زور دیا کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں رہے، چنانچہ انجمن حمایت الاسلام بنی۔[1]"

شہرت کا کوئی دیوان یا کلام دستیاب نہ ہو سکا البتہ کچھ اشعار عبیر ہندی میں حمد، نعت اور زبان اردو کے عنوان سے ملتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں مگر اشعار ہلکے اور پھیکے ہیں۔ ان میں نہ تو شعریت ہے اور نہ کوئی گہرائی ہے ؎

نعت

——— احمدؐ ہیں جہاں میں فخر عالم
ان کی صفت نہ کر سکیں ہم

——— حق پاس جو آسماں پہ پہونچے
حیران ہیں سب کہاں پہ پہونچے

——— اندھیرا تھا یاں کیا اوجالا
ظلمت کو جہان سے نکالا

غزل کے اشعار کا نمونہ پیش خدمت ہے

یہ جنت ایک پائیں باغ ہے اس گل کے ایواں کا
جہنم اک شرارہ ہے ہمارے داغ سوزاں کا

---

[1] عبیر ہندی از نثار علی شہرت دارالاشاعت لاہور مخزونہ دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی۔

——— ہیں اس میں داغ لیکن ہیں ستارے اس میں نور افشاں
کہاں ہے ماہ میں عالم ترے ماتھے کے افشاں کا

——— فنا ہوتے ہی پہنچا ایک منزل اس سے بھی آگے
پتہ کوئی بتاتا ہی نہ تھا عمر گریزاں کا

——— یہ ہے لحاظ تیرا مجھے کوئے غیر میں
آنکھوں کے بل گیا میں کبھی سر کے بل گیا[1]

زبان اردو

ہے اردو زبان کا بول بالا
جس نے کئی سوکنوں کو ٹالا
کل ہند میں سکہ اس کا جاری
خوش قسمتی ہے مگر ہماری
پنجاب سے اس کے حسن کی دھوم
پہنچی ہے کابل اور تا روم

شیدا ——— میر جھبو خاں ——— متوفی ۱۸۵۳ء / ۱۲۷۰ھ

تذکرہ طور کلیم میں شیدا کے متعلق لکھا ہے :۔

"میر جھبو جان[2] در ایام شباب ازیں خاکدان رحلت کرد۔ از تلامذہ مومن خاں بود با حضرت شیفتہ تردمودت می یافت"

---

[1] خم خانۂ جاوید

[2] شیدا کے نام کے متعلق مختلف تذکروں میں مختلف انداز سے ہیں۔ میر جھبو خاں۔ خمخانہ جاوید حصہ ۵ ص ۱۲۹۔ میر جھبو خاں جلوہ خضر ص ۲۴۴۔ میر جھو بجان طور کلیم ص ۶۰۔ میر جھبو جان سخن شعرا ص ۲۶۴۔ میر جھبو جان۔ گلستان سخن ص ۲۹۹۔ میر جھبو جان انشائے مومن خط نمبر ۶۳

شیدا نے ۱۲۷۰ھ میں بعالم شباب وفات پائی۔[1] کلام میں صفائی اور بندش میں چستی ہے۔ انھوں نے استاد کا رنگ اور انداز قائم رکھا۔ جو مختصر کلام تذکروں میں ملتا ہے وہ پیش ہے۔

ناشکر ہم نہیں ہیں ادھر کو نگاہ ہے
پر وہ نگاہ جس سے عنایت عیاں نہیں
وہ نہیں دل جو کسی کے لیے بیتاب نہیں
وہ نہیں چشم جو آلودۂ خوں ناب نہیں
تیرے رخسار کو کس چیز سے دیجئے تشبیہ
گل میں یہ آب نہیں شمع میں یہ تاب نہیں
دریا بہیں کہیں کہیں مژگاں بھی تر نہ ہو
مر جائے کوئی اور کسی کو خبر نہ ہو
وہ دشمنی میں پورے ہوں یہ بات بھی نہیں
کہتے ہیں زہر دے کے الٰہی اثر نہ ہو
کہتے ہیں اس کے کوچے میں مارا گیا کوئی
مجھ کو یہ خوف ہے کہ مرا نامہ بر نہ ہو
کہیں وہیں نہ ہو شیدا کہ اس کے کوچہ میں
نظر پڑا تھا کل اک مضطرب غبار مجھے
مگر عدو سے ہے وعدہ کہ خود بہ خود شیدا
کچھ اضطراب میں ہیں دل کے اضطراب سے ہم[2]

شیفتہ ـــــــ نواب مصطفےٰ خاں۔ ولادت $\frac{۱۸۰۶ء}{۱۲۲۱ھ}$ متوفی $\frac{۱۸۶۹ء}{۱۲۸۶ھ}$

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، خلف عظیم الدّولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر

---

[1] خمخانہ جاوید ص ۱۲۹

[2] جلوہ خضر ص ۲۴۴۔ طور کلیم ص ۶۰۔ سخن شعرص ۲۶۴۔ خمخانہ جاوید ص ۱۲۹

خلف ولی داد خاں۔ شیفتہ کی والدہ جرنل اسمٰعیل بیگ ہمدانی کی صاحبزادی اکبری بیگم تھیں۔ جب دلی کی سلطنت میں خانہ جنگی اور بدامنی شروع ہوئی تو مرتضےٰ خاں ہلکر کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ جب لارڈ ہلکر کی فوج کے مقابلہ پر آیا تو نواب مرتضیٰ خاں نے اپنے حسن سلیقہ سے دونوں میں صلح کرادی: جس کی وجہ سے دونوں فوجیں بڑی خونریزی سے محفوظ رہیں۔ اس صلح میں لارڈ لیک نے ہوڈل اور پلول (گوڑگاؤں) کی جاگیر عنایت کی۔ اس زمانہ میں جہاں گیر آباد (ضلع میرٹھ) کا علاقہ نیلام ہو رہا تھا وہ بھی نواب مرتضیٰ خاں نے خرید لیا۔ چوں کہ ہوڈل اور پلول کا علاقہ نواب مرتضیٰ خاں کی زندگی تک کے لئے دیا گیا تھا۔ لہٰذا ان کے مرنے کے بعد انگریزوں نے واپس لے لیا۔ مگر قدیم خدمات کی بنا پر بیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن جہاں گیر آباد خود ان کا اپنا خریدا ہوا تھا اس لیے اس سے تعرض نہیں کیا۔

نواب مصطفےٰ خاں ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مشہور اساتذہ سے حاصل کی اور جلد عربی اور فارسی میں دستگاہ کامل بہم پہنچائی۔ جب شیفتہ حج کو گئے تو علمائے حرمین شریفین سے حدیث کے سبق اور سند حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں حاجی محمد نور، شیخ عبداللہ، سراج حنفی اور شیخ محمد عابد سندھی جیسی باکمال شخصیتیں تھیں۔

شیفتہ کی زندگی کے دو رخ ہیں۔ ایک تو ان کی وہ زندگی جو عیش و عشرت اور لہو و لعب میں گزری: جس کو ایک امیرزادہ یا جاگیر دار کی زندگی کہا جا سکتا ہے۔ شعر و شراب و شاہد ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کی مشہور طوائف نارنول والی رمجو سے شیفتہ کے تعلقات زبان زد خاص و عام تھے۔ ان حالت میں غفلت نے کبھی سوچنے نہ دیا کہ انجام کیا ہوگا۔ اور زندگی کا دوسرا رُخ وہ ہے جب ہدایت غیبی نے دستگیری کی اور داعیہ باطنی نے دل کھینچا اور ہر قسم کی خرافات سے نہ صرف توبہ کر لی بلکہ ایسی مذہبی زندگی گزاری کہ شاید ملائکہ کو بھی رشک آتا ہو۔ انھوں نے پھر اپنی گزشتہ بے راہ روی کا کفارہ ادا کرنے کے

---

[1] تلامذہ غالب ص ۱۷۷

[2] تلامذہ غالب ص ۱۷۸

کہ انھوں نے اپنے گھر کے باہر ایک بورڈ لٹکا رکھا تھا، جس پر طرحی مشاعروں کے غزلوں، عام غزلوں، سات شعر کی غزلوں اور نو شعر کی غزلوں وغیرہ کا معاوضہ درج ہوتا تھا۔ استادی اور شاگردی کے رشتے کا ایک اور منفی یا غیر ادبی پہلو یہ بھی ہے کہ استاد مشاعروں میں داد حاصل کرنے کے لیے اپنے طرفداروں یا شاگردوں کو ضرور لے جاتے تھے۔ جس شاعر کے جتنے شاگرد ہوتے، اتنی ہی اس کو مشاعرے میں داد ملتی۔ کیوں کہ اُستاد کے مصرعہ اُٹھانے سے پہلے ہی شاگرد واہ واہ کا شور مچا دیتے۔ اس لیے بعض اُستاد اپنے شاگردوں کو شعر کہہ کر دیا کرتے تھے، جو موزوں طبع نہیں تھے۔ اس طریقۂ کار نے مشاعروں میں گروہ بندی کی وَبا کو جنم دیا۔ اگر ایک اُستاد شعر پڑھ رہے ہیں تو اس کے شاگرد واہ واہ کے شور سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے تھے۔ اِس کے برعکس دوسرے استاد کے شاگرد خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ اسی طرح جب دوسرے شاعر کی باری آتی تو پہلے استاد کے شاگردوں کو سانپ سونگھ جاتا۔ اس کے علاوہ استادی اور شاگردی کے رشتے نے جانب داری کو فروغ بھی دیا اور بعض بہت پڑھے لکھے لوگ بھی ایسی حرکتیں کرنے لگے، جو انھیں زیب نہیں دیتی تھیں۔ مثلاً محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں لکھا ہے کہ ظفر کا سارا کلام ان کے اور بہادر شاہ ظفر کے مشترکہ اُستاد ذوق کا کہا ہوا ہے۔ یہ یقیناً غلط اور بے بنیاد الزام ہے۔ بقول فراق گورکھپوری: ذوق ظفر کو شعر کہہ کر تو کیا دیتے، خود ظفر کی بدولت انھیں زبان کا سلیقہ آگیا۔ اصلاح کے فن پر اُردو میں متعدد کتابیں ملتی ہیں، ان میں بعض استاد شاعروں نے ان اصلاحات کو مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، جو انھوں نے اپنے شاگردوں کو دی ہیں۔ چند بڑے شاعروں نے اپنے بعض شاگردوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں اصلاحِ کلام کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر غالب نے اپنے شاگردوں کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں اصلاح کی بے شمار مثالیں ہیں۔ غالب لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے شاگرد کی اصلاح کرتے ہیں اور اگر کوئی شعر وزن سے گر رہا ہوتا ہے تو اس کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ غالب پہلے اصلاح دیتے ہیں اور پھر اس کی تفصیلی توجیہہ پیش کرتے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد اُردو میں خاصی ہے۔

میں یہاں فنِ اصلاح پر دو کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک سیماب اکبر آبادی کی

لیے حج و زیارت کا قصد کیا اور ۱۸۹۳ء میں عازم حج حجاز ہوئے۔ مذہبی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ ان بزرگان دین سے کمال عقیدت اور محبت تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے شاہ عبدالعزیز کے نواسے شاہ محمد اسحاق ؒ سے بیعت کی۔ ان کے وصال کے بعد شاہ ابوسعید ؒ اور شاہ احمد سعید کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور آخر میں شاہ عبدالغنی مجددی سے تکمیل سلوک کے بعد سند خلافت لی۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ جیسا کچھ قیامت خیز تھا۔ امیر فقیر، باعزت، بے عزت اور شریف رذیل ہو گئے۔ اس آگ کی لپیٹ میں چھوٹے بڑے سب آ گئے۔ شیفتہ بھی نہ بچ سکے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ جہانگیر آباد غیر محفوظ ہے تو وہ اپنے گھر بار کے ساتھ خان پور چلے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں باغیوں نے جاگیر میں آگ لگا دی اور ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیا۔ مگر اتفاق سے رام پور کی فوج جو تلنگوں کی سرکوبی کے لیے جا رہی تھی۔ اس نے جب یہ دیکھا تو باغیوں سے نجات دلائی۔ ہنگامۂ غدر فرو ہونے کے بعد جاگیر کو غیر محفوظ چھوڑ دینے کے جرم میں شیفتہ پر مقدمہ چلا اور سات سال کی قید کا حکم سنایا گیا۔ اپیل سے بری تو ہو گئے مگر جاگیر ضبط کر لی گئی۔ بعد کو نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کی کوشش سے آدھی جائیداد واگذاشت ہوئی۔

شیفتہ کی تصانیف میں کلیات شیفتہ و حسرتی ہے جو نظامی پریس بدایوں سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ان کا اردو اور فارسی کلام شامل ہے۔ ان کا ایک قلمی کلیات کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔ غالباً یہ ہندوستان اور پاکستان کا واحد قلمی نسخہ ہے۔ اس میں بہت سا کلام ہے جو مطبوعہ نہیں ہے۔ خصوصاً تین مثنویاں جو ان کی محبوبہ رجو سے متعلق ہیں۔ اس کی بہن ننھی کا بھی ذکر ہے۔

مالک رام تلامذۂ غالب میں گارساں دتاسی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیفتہ نے علامہ ابن جوزی کے مولد کا بھی عربی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے حجاز کا سفر نامہ "رہ آورد" بھی لکھا۔ مگر ان کا شاہ کار ان کا اردو شاعروں کا فارسی تذکرہ "گلشن بے خار" ہے۔ یہ تذکرہ انھوں نے ۱۸۳۷ء میں لکھا تھا، جب کہ ان کی عمر تیس سال تھی۔ اس

تذکرہ کی خوبی یہ ہے کہ جس شاعر کی نسبت جو رائے شیفتہ نے اس وقت لکھ دی وہ آج بھی ناقدین فن کے یہاں تسلیم کی جاتی ہے۔

شیفتہ نے دو عقد کیے۔ پہلی بیگم سے محمد علی خاں رشکی ہوئے اور دوسری سے دو بیٹے نقش بند خاں اور اسحاق خاں اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ شیفتہ نے ۱۸۶۹ء میں ۶۳ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ حالی نے تاریخ وفات وجزاھم بما صبروا جنات وحریرا " سے نکالی۔ یہی لوحِ مزار پر کندہ ہے (۱) نساخ نے مادۂ تاریخ نکالا۔

نساخ مصرعہ پئے تاریخ زد رقم
صد حیف، حیف وائے صد افسوس حسرتی

شیفتہ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ شعر و ادب کا زمانہ تھا۔ اس وقت کی غالب مومن ذوق آزردہ صہبائی اور نیر کی دلی تھی۔ ان لوگوں کی صحبت اور اس پر شیفتہ کی طباعی اور سخن دانی جس پر حالی کو کہنا پڑا تھا کہ ان کو غالب سے وہ فیض حاصل نہیں ہوا جو شیفتہ کی صحبت سے ملا۔ آثار الصنادید میں سرسید ان کے متعلق لکھتے ہیں :۔

.... " ذکر سخن وری اور معنی پروری کا کروں تاکہ بسبب فی الجملہ ممارست کے خامہ قاصر البیان لسان کر سکے۔ جب اس جگہ پر قدم رکھا ہر مضمون پست کو اس درجہ بلند پر دیکھا کہ کنگرہ عرش بایں سر بلندی اس زروہ سے ہزار پایہ نیچے تھا اور طائر سدرہ پرواز سو برس کے پرواز کے بعد وہاں تک پہنچ نہ سکا تھا۔ .... بلبل کی خوانی اور قمری کی فصیح بیانی انھیں کی نستعلیق گوئی سے مستفاد ہے۔ الحق یہ پایۂ فصاحت کا اور یہ سرمایہ بلاغت کا خداداد ہے۔" (۱)

تذکرہ بہار بے خزاں (قلمی) ۱۸۴۵ء / ۱۲۶۱ھ میں احمد حسین سحر لکھتے ہیں :۔

---

(۱) شیفتہ کا مزار تلاش کیا مگر اس لوحِ مزار کے ساتھ نہ ملا۔
(۲) آثار الصنادید ص ۱۱۱، ایڈیشن ۱۸۹۵ء

"نواب مصطفےٰ خاں صاحب "تذکرہ گلشن بے خارا از مشاہدہ نظم و نثر
تذکرہ اش می تواں دریافت کلک آشفتہ یارائے تحریر و توصیفش ندارد"(۱)

تذکرہ طور کلیم میں شیفتہ کے متعلق تحریر ہے :-

"حضرت شیفتہ از روان صبا بہ مشق سخن مصروف بود و عمرے دریں شغل بسر
بسر بود۔ در مراتب نظم و نثر ادائے خاص دارد و بہ ہر دو زبان ریختہ
و پارسی سحرے می طرازد۔"(۲)

جیسا کہ ابھی تحریر کیا گیا کچھ تو صحبت کا اثر تھا اور کچھ خداداد صلاحیت جس نے شیفتہ کو صفِ اوّل کے استادوں میں جگہ دی۔ ایک طرف فارسی اور اُردو شاعری میں ان کا ذوق بلند اور دوسری طرف تنقید و شعر میں ان کا پایہ ارجمند۔ یہی وجوہ تھے کہ تمام اہلِ علم ان کا احترام کرتے تھے۔

شیفتہ اوّل مومن کے شاگرد تھے ان کو مومن سے خاص عقیدت تھی اور محبت تھی جیسا کہ گلشن بے خار کی عبارت سے ظاہر ہے ان کے انتقال کے بعد غالب سے اصلاح لی۔ شیفتہ ان شاگردوں میں تھے جن پر استاد کو ناز تھا۔ غالب کہتے ہیں :-

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل
چوں او تلاشِ معنی و مضمون نکردہ کس

شیفتہ نے اُردو شاعری کا جو بلند معیار قایم کیا وہ ہماری شاعری کا ایک اہم موڑ تھا، جس پر آئندہ جدید ادب کی بنیاد رکھی گئی۔ شیفتہ کے معیار شعر کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔(۳)

---

(۱) بہار بے خزاں (قلمی) آزاد لائبریری۔ علی گڑھ۔ ص ۹۳ (۲) طور کلیم۔ ص ۶

(۳) یہ شیفتہ کا یہ نغمہ حالی کے یہاں اس طرح نظر آتا ہے :-

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں	پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام	ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری	قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجو نماز تو

شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نامعقول
اگر اسلوب عبارت میں متانت کم ہو
وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

اپنے دیوان کے متعلق اس معیار کو سامنے رکھتے ہوئے کہا ہے۔

یہ بات تو غلط ہے کہ دیوانِ شیفتہ
ہے نسخۂ معارف و مجموعہ کمال
لیکن مبالغہ تو ہے البتہ اس میں کم
ہاں ذکر جعد و خال اگر ہے تو خال خال

شیفتہ جیسے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے ویسے بلند پایہ ناقد بھی تھے۔ گلشن بے خار کو تمام تذکروں میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ فارسی زبان میں اُردو شعرا کا تذکرہ ہے جو سنہ ۱۸۴۷ء/۱۲۵۳ھ میں لکھا گیا۔ مومن نے اس کی تاریخ لکھی :-

ہاتف نے کہا، ہے اس کی تاریخ
گل دستہ گلستاں معنے

شیفتہ کا نمونہ کلام ہدیۂ ناظرین ہے جس سے ان کے خیالات کی "مناسب الفاظ کی نشست کی خوبی" انداز کی شگفتگی اور اسلوب عبارت کی متانت" اخلاق تصوف اور ہر رنگ کا فلسفہ موجود ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

مرتے کا مرے نہ ذکر کرنا
قاصد وہ بہت الم کریں گے
دلی میں تو شیفتہ ہے استاد
ہم قصد سوئے عجم کریں گے

ہائے وہ شیفتہ کی بے تابی
تھام لینا وہ تیرے محمل کو

زندگانی سے خفا ہوں اپنی
پھر کہو تم کو سناؤں کیوں کر

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر
یہ اہلِ مروّت ہیں تقاضا نہ کریں گے

دشمن کہیں گیا نہ ہو آنکھوں سے شیفتہ
اس کی گلی میں آج نشانِ قدم نہیں

آرام سے ہے کون جہان خراب میں
گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
شوخی نے تیرے لُطف نہ رکھا حجاب میں
جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

اِس کوچہ میں اے نکہتِ گُل جلوہ عبث ہے
ہم کچھ ہوسِ سیر و تماشا نہیں رکھتے
اے شیفتہ ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے
شوقِ صنم و خواہشِ صہبا نہیں رکھتے

عجب ہی شہر ہے دِلّی بھی شیفتہ ہرگز
ہیں روم و شام نہ لوں اس دیار کے بدلے

اے مرگ آ کہ میری بھی رہ جائے آبرو
رکھا ہے اس نے سوگ عدو کی وفات کا

ایمن ہیں اہل جذبہ کہ رہبر ہے ان کے ساتھ
سالک کو ہے خیال نشیب و فراز کا

طوفانِ نوحؑ لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

یاد نے جس کی بھلایا سب کو
اس کی مَیں یاد بھلاؤں کیوں کر (۱)

صاحبؔ ـــــ امۃ الفاطمہ بیگم ـــــ

امۃ الفاطمہ لکھنؤ کی رہنے والی ایک پردہ نشین طوائف تھی جو صاحب جی کے نام سے مشہور ہوئی۔ سیر و سیاحت کے لیے دہلی کا رُخ کیا اور دہلی آ کر بیمار ہو گئی۔ اتفاق دیکھیے کہ علاج کے لیے جس معالج کا نام تجویز ہوا وہ مومن خاں تھے۔ وہ کچھ ایسی ساعت تھی کہ طبیب خود مریض بن گیا۔ صاحب جی کے بارے میں ہم تفصیل سے مومنؔ کے سوانحی باب میں لکھ آئے ہیں۔

غرض مومنؔ نے علاج کیا صحت یاب ہونے پر ایک سال تک مومنؔ کے ساتھ

(۱) آثار الصنادید ایڈیشن دوم ۱۱۰۔ قاموس المشاہیر حصۂ دوم ص ۲۳۔ خم خانۂ جاوید ص ۱۵۵۔ جلوۂ خضر ص ۲۲۹۔ گل رعنا ص ۳۲۶ تلامذہ غالب ص ۱۷۷۔ بزم سخن ص ۱۷۔ طبقات الشعرا ص ۳۷۰۔ بیاض سخن قطعہ منتخب ص ۱۶۔ طور کلیم ص ۶۰ کلیات شیفتہ (مقدمہ) یادگار مشاعرہ ص ۹۷۔ گلشن بے خار ص ۱۱۶۔ سخن شعرا ص ۲۶۶ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی) ص ۱۲۳۰۰۔ بہار بے خزاں (قلمی) ص ۹۳۔ طور کلیم ص ۱۶۰ اردوئے معلّیٰ (رسالہ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء گلستان سخن ص ۳۰۳

رہی اور انہی کی صحبت میں رہ کر شعر و سخن میں دل چسپی ہو گئی اور خود بھی شعر کہنے لگی۔ جو کچھ کہتیں وہ مومن کو دکھاتیں۔ بقولِ شیفتہ "بہ فیضِ محبت شاں (مومن خاں) دلش بہ شعر و شاعری میل کرد۔"

صاحب جی کا ذکر ہر تذکرہ میں ملتا ہے مگر اس کے اشعار صرف چھ دستیاب ہوئے اور ہر تذکرہ میں یہی چھ شعر ملتے ہیں۔ اشعار میں مومن خاں کا رنگ نمایاں ہے۔

رقیبوں کا چلنا کہاں دیکھتا تو
سماں میرے گھر میں یہ آیا تو دیکھا
گنہ کیا صنم کے نظارہ میں زاہد
یہ جلوہ خدا نے دکھایا تو دیکھا

کھولے ہیں اس نے پیرہن یوسفی کے بند
یہ کہہ رکھے نسیم سے کہہ دو قبائے گُل

نظر ہے جانبِ اغیار دیکھتے کیا ہو
پھری ہے کچھ نگہ یار دیکھتے کیا ہو

جو خط جبیں کا مرے کاتب ہے اسی کو
دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الٰہی
صاحب جو بنایا ہے تو مانند زلیخا
یوسف سا غلام اک مجھے دے ڈال الٰہی (۱)

---

(۱) خم خانہ جاوید حصہ پنجم ص ۱۴۲۔ طبقات الشعرا ص ۱۷۳۔ گلستان بے خزاں ص ۱۳۸۔ گلشن بے خار ص ۱۲۴۔ تذکرۃ الخواتین ص ۱۰۸۔ بہار بے خزاں (قلمی) ۹۵۔ شمیم سخن ص ۱۸۔ بہارستان ناز ص ۶۲۔ گلشن ناز ص ۵۴۔ معرکہ خوش تر یا ص ۱۱۳۰۰

صبؔر ـــــ اجودھیا پرشاد نام ۔صبؔر تخلص۔ دہلی کے رہنے والے تھے اور قوم کے کائستھ تھے ۔منشی بسنت سنگھ نشاؔط اور شاہ نصیر کو کلام دکھایا کرتے تھے اور آخر میں مومؔن خاں کے حلقہ تلمذ داخل ہو گئے۔(۱) ان کے ذکر سے عام طور پر تذکرے خاموش ہیں ۔نمونۂ کلام یہ ہے :-

زیست کم حسرت بہت کس کس کا شکوہ کیجیے
طالع خوابیدہ کا یا دیدۂ بیدار کا

ہمیں گماں کہ وہ آئے ہمارے قابو میں
انھیں یقیں کہ مرے ہاتھ اک شکار آیا

دِل لگانے کو بتاتا ہے تو مشکل ناصح
تیرے نزدیک چھڑانا مگر آساں ہوگا

بدنامیاں ہیں باعثِ نام آوری یہاں
ہم جانتے تھے عشق میں کچھ عزّ و شاں نہیں

خزاں کے روز تو رو رو کے باغ میں کاٹے
پھنسے قفس میں جو اب موسمِ بہار آیا

صبؔر کب دیتے تھے ہم اس کاکل پیچاں کو
آپ سے مانگا تو پھر موقع نہ تھا انکار کا

---

(۱) خم خانہ جاوید حصہ پنجم ص ۴۷۔ ۲۔ بزم سخن نے ان کو شاہ نصیر کا شاگرد لکھا ہے۔ ص ۵۷۔ مگر صاحب گلستان سخن نے ان کو شاہ نصیر کے بعد مومن کا شاگرد بتایا ہے۔

زاہد تجھے خبر ہی نہیں یہ بتانِ دہر
ملتے ہیں اس سے جس پہ خدا کا کرم ہوا (۱)

صفیر ــــ میاں جان ــــ متوفی ۱۸۷۳ء / ۱۲۹۰ھ

میاں جان صفیر دہلی کے رہنے والے اور مومنؔ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے وہ مشاعرے دیکھے تھے جن میں مومنؔ و غالبؔ نے اپنے کلام سنائے ہیں۔ ایک عرصہ تک مہاراجہ پٹیالہ کے دربار میں بزمرہ شعرا ملازم رہے۔ آخر میں ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔ (۲)

نمونۂ کلام کے چند اشعار تذکروں میں ملتے ہیں :۔

کہتے ہو جان جائے تری اور تمھیں ہو جان
ہے ہے خدا نخواستہ یہ تم نے کیا کہا

نہ تم سے ترکِ جفا اور ہم سے ترکِ وفا
نہ اختیار تمھارا نہ اختیار اپنا

کیا خبر تھی کہ اسی دَر پہ پڑے گا جا کر
یہ دُعا دیتے نہ گھر غیر کا ویران ہوتا

چڑھتے ہیں ہزاروں گُل تُربت پہ صفیرؔ اپنی
مَرنا مرا بلبل کی قسمت میں لکھا ہوتا

مر کر بھی جستجو نہیں جاتی ہے یار کی
مٹی خراب ہے مری مشتِ غبار کی

---

(۱) خم خانۂ جاوید ص ۴۰۲۔ بزم سخن ص ۵۱، گلستان سخن ص ۲۱۷ (۲) خم خانہ جاوید ص ۳۳۷ (۳) خم خانۂ جاوید ص ۳۳۷۔ جلوہ خضر ص ۲۴۵۔ طور کلیم ص ۶۶ سخن شعرا ص ۲۸۳ گلستان سخن ص ۳۴۲

ہُوا ہو سہو تو پھر خوب یاد کر لیجیے
کہ رہ نہ جائے کوئی جورِ امتحاں کے لیے[1]

ظہور ـــــ ظہور علی صدیقی ـــ ولادت ۱۸۰۶ء / ۱۲۲۱ھ وفات ۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ

مولوی ظہور علی خلف مولوی فتح علی۔ مولد ہریانہ مسکن دہلی تھا[2] ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد سرکار انگریزی میں جاگیردار تھے۔ یہ ۱۲۲۱ھ میں پیدا ہوئے۔ (۳)

انھوں نے کتبِ درسیہ مفتی صدرالدین آزردہ سے پڑھیں۔ خوش نویسی میں خاص ملکہ بہم پہنچایا۔ سنہ ۱۸۵۷ء تک تھانے داری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مگر پولیس کی نوکری اور شعر و ادب کا ذوق دونوں کا ساتھ نہ چل سکا۔ چنانچہ پولیس کی نوکری ترک کی اور سررشتہ تعلیم میں فارسی کے مدرس ہو گئے۔ اکثر حکومت سے انعام اور صلہ پاتے رہتے تھے۔ ان کو بہادر شاہ سے شمس الشعراء کا خطاب عطا ہوا تھا۔ (۴)

آخر بہ عمر ۶۵ سال ۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ میں دُنیا سے رحلت کی۔

ظہور کو فنِ معما سے خاص دل چسپی تھی اور اس میں بڑا کمال تھا، انھوں نے ایک منظوم رسالہ جس میں معمے حل کرنے کے قاعدے درج تھے مرتب کیا تھا۔ جس کو مرزا قادر بخش گورگانی نے طبع کرایا تھا مگر غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا۔ (۵)

غزلوں کے علاوہ انھوں نے قصیدے اور مرثیے بھی لکھے۔ تاریخ گوئی میں بھی خاص ملکہ تھا۔ دیوانِ ظہوری کا نسخہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے پاس ہے[6] تیر ایک نسخہ محب کشور ہند میرٹھ ۱۸۲۲ء / ۱۳ھ کا شائع کردہ کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔

---

(۱) خم خانہ جاوید ص ۷-۳۲۔ جلوہ خضر ص ۲۴۵۔ طور کلیم ص ۶۶ سخن شعرا ص ۲۸۲ گلستان سخن ص ۲۴۲-۳۔ ۱
(۲) سخن شعرا ص ۳۱۱۔ (۳) خم خانہ جاوید ۹-۴۷۔ معاصر (رسالہ) حصہ ۱۷۔ یادداشت از قاضی عبدالودود ص ۹۴
(۴) خم خانہ جاوید حصہ پنجم ص ۹-۴۷۔ معاصر (رسالہ) پٹنہ حصہ ۱۷۔ قاضی عبدالوجود ص ۹۶ (۵) خم خانہ جاوید حصہ پنجم ص ۹-۴۷۔ (۶) معاصر (رسالہ) پٹنہ حصہ ۱۷۔ قاضی عبدالودود ص ۹۷-۹۶ (بحوالہ مقدمہ دیوانِ ظہور) (۷) گلشن بے خار ص ۱۳۶۔